بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار

اور

تنظیمِ فکرِ ولیُ اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ

پر مزید تبصرے اور ماہنامہ الشریعہ کے تبصرہ پر استدراک

''مولانا عبید اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرِ ولیُ اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ'' کا تیسرا ضمیمہ

مولانا سندھی کی تحریروں و امالی اور تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی

کے نظریات کے بارے میں چند شبہات کا ازالہ

مؤلف

مفتی محمد رضوان

ادارہ غفران، راولپنڈی، پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار

اور

تنظیمِ فکرِ ولیُ اللّٰہی کے نظریات

کا تحقیقی جائزہ

پر مزید تبصرے اور ماہنامہ الشریعہ کے تبصرہ پر استدراک

’’مولانا عبیداللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرِ ولیُ اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ‘‘ کا تیسرا ضمیمہ
مولانا سندھی کی تحریروں و امالی اور تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی
کے نظریات کے بارے میں چند شبہات کا ازالہ

مؤلف
مفتی محمد رضوان

ادارہ غفران، راولپنڈی، پاکستان
www.idaraghufran.org

نام کتاب: مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرِ ولیُ اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ پر مزید تبصرے اور ماہنامہ الشریعہ کے تبصرہ پر استدراک

مؤلف: مفتی محمد رضوان

طباعتِ اوّل: ذوالقعدۃ 1438ھ ،اگست 2017ء

صفحات: 160

ملنے کے پتے

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

(از مؤلف)

بندہ کی تالیف ”مولانا عبید اللہ سندھی کے افکار اور تنظیمِ فکرِ ولیُ اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ“ کا دوسرا ایڈیشن بحمداللہ تعالیٰ شائع ہو چکا ہے۔

پہلے ایڈیشن پر اہلِ علم واہلِ قلم حضرات کی طرف سے جو آراء وتبصرے موصول ہوئے تھے، وہ دوسرے ایڈیشن کے آخر میں ضمیمۂ ثانیہ کے طور پر شائع ہوئے ہیں۔

اس تالیف کے دوسرے ایڈیشن پر بھی بعض مجلّات ورسائل میں تبصرے شائع ہوئے، بالخصوص ماہنامہ ”الشریعۃ“ میں ایک تفصیلی تبصرہ شائع ہوا۔

اس تبصرہ کے متعلق بندہ کو ایک صاحب کا خط موصول ہوا، جس کا بندہ نے قدرے تفصیل سے جواب لکھا، جس میں بعض ایسی ابحاث بھی آ گئیں، جو اس سے پہلے ایڈیشنز میں زیرِ بحث نہیں آئی تھیں۔

اس دوران میں مولانا سندھی کی فکر پر چند اور اہلِ علم کی تحریریں دستیاب ہوئیں۔

اب تیسرے ضمیمے کے طور پر مندرجہ بالا تمام تحریریں شائع کی جا رہی ہیں۔

اللہ تعالیٰ حق واعتدال پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

فقط

وَاللّٰہُ سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی اَعْلَمُ وَعِلْمُہٗ اَتَمُّ وَاَحْکَمُ.

محمد رضوان

22/ جمادی الاولیٰ/ 1438ھ 20/ فروری/ 2017ء بروز پیر

ادارہ غفران، راولپنڈی

''مولانا سندھی کے افکار اور تنظیمِ فکرِ ولی اللّٰہی کے نظریات...... (اشاعتِ دوم)'' پر تبصرہ

(از: محمد سفیر الاسلام)

مندرجہ بالا عنوان کے تحت مفتی محمد رضوان صاحب کی تالیف ستمبر 2014ء میں ادارۂ غفران، چاہ سلطان گلی نمبر 17 راولپنڈی (فون نمبر 051-5507270) نے شائع کی تھی۔ اِس وقت ہمارے سامنے اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے جو حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ اس ایڈیشن میں چند اضافے بھی کیے گئے ہیں۔ واضح رہے کہ مولانا سندھی' تحریکِ آزادیِ ہند کے رہنما اور شاہ ولی اللہ دہلوی کی فکر کے علم بردار اور شارح کی حیثیت سے متعارف ہیں۔

ہفت روزہ ''فرائیڈے اسپیشل'' کے اعزازی تبصرہ نگار ملک نواز احمد اعوان صاحب نے مجلّے کی 6 تا 12 فروری 2015ء کی اشاعت میں اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کا ایک جامع تعارف کرایا تھا۔ انہوں نے لکھا کہ زیرِ نظر کتاب میں فلسفہ وفکرِ ولی اللّٰہی اور مولانا عبیداللہ سندھی کے متعلق اہلِ علم اور اہلِ افتاء کی آراء، تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کی حضرت شاہ ولی اللہ کی طرف نسبت کی حقیقت' مولانا سندھی کی طرف منسوب غیر معتدل اور شاذ افکار پر کلام اور مولانا سندھی اور تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کے متعلق متعدد اکابر علماء اور اہل قلم حضرات کی تحریریں اور فتوے شامل ہیں۔ انہوں نے لکھا کہ اس قسم کی مؤلفات جن میں ایک ہی موضوع پر موافقانہ یا مخالفانہ تحریریں جمع کر دی جاتی ہیں، تحقیق کرنے والے کے لیے بے پناہ سہولت کا باعث ہوتی ہیں۔ اس لیے ان کے مرتبین کا خصوصی شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ مفتی رضوان صاحب نے جو مضامین اس کتاب میں شامل کیے ہیں ان کے عنوانات اور مصنفین کے اسماء گرامی اس طرح

ہیں:

مولانا سندھی اور تفسیر بالرائے از مولانا اشرف علی تھانوی، التقصیر فی التفسیر از مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا سندھی کے افکار کی شرعی حیثیت از مولانا حسین احمد مدنی، مولانا احمد علی لاہوری کا مولانا سندھی سے اختلاف کے متعلق مکتوب، مولانا سندھی کے افکار کے متعلق مولانا احمد علی لاہوری کا موقف از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا لاہوری کے مولانا سندھی سے اختلاف کی وجہ از ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری، [مولانا سندھی کے افکار کے بارے میں] مولانا شبیر احمد عثمانی کا مکتوب، مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا سندھی کے درمیان فکر ونظر کے اختلاف کی نوعیت از مؤلف، مولانا سندھی کے افکار کا تحقیقی جائزہ از مولانا مناظر احسن گیلانی، [ماہنامہ] طلوعِ اسلام، مولانا سندھی اور شاہ ولی اللہ از مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا سندھی کے افکار وخیالات از مولانا سید سلیمان ندوی، ''مولانا عبیداللہ سندھی'' مصنّفہ پروفیسر محمد سرور کا ایک ناقدانہ جائزہ از مولانا مسعود عالم ندوی، فکرِ مولانا سندھی از مولانا عبدالماجد دریابادی، شاہ ولی اللہ کی عبارتوں کا غلط استعمال از مبصر ہفت روزہ صدق، مولانا سندھی کے ''افکار عالیہ'': علمائے اسلام کے لیے لمحۂ فکریہ از مولانا عبدالصمد رحمانی، مولانا سندھی کے متعلق مولانا مفتی محمد شفیع اور مولانا یوسف بنوری کا موقف از مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، ''مولانا سندھی کے علوم وافکار'' پر نقد وتبصرہ از مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، تنظیمِ فکرِ ولی اللّٰہی اور مولانا سندھی از مولانا ڈاکٹر مفتی عبدالواحد، مولانا سندھی: ایک قابلِ تحقیق شخصیت از مولانا ابن الحسن عباسی، افادات وملفوظاتِ امام سندھی مرتبہ پروفیسر محمد سرور پر تبصرہ از شکیل عثمانی، مولانا سندھی کی فکر کے مضمرات از حافظ محمد موسیٰ بھٹو۔ اس کے علاوہ مولف نے بطور ضمیمہ مولانا سندھی کی فکر پر قائم جماعت، تنظیم فکر ولی اللّٰہی کے بارے میں وفاق المدارس العربیہ کا فیصلہ، دارالعلوم دیوبند سمیت مختلف دینی مدارس کے فتاویٰ اور علماء کرام کی آراء بھی کتاب میں شامل کی ہیں۔

کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں دو اضافے کیے گئے ہیں:

اولاً بطورِ ضمیمہ کتاب کے پہلے ایڈیشن پر اہلِ علم اور اہلِ قلم حضرات کی آراء اور تبصروں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ ان اہل علم میں مولانا سلیم اللہ خاں صاحب، مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب، مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، مولانا مفتی عبدالرؤف سکھروی صاحب، مولانا مفتی محمود اشرف عثمانی صاحب، مولانا ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری صاحب، مولانا مفتی عبدالقدوس ترمذی صاحب' مولانا سید نجم الحسن تھانوی صاحب' مولانا مفتی زین الاسلام قاسمی صاحب، مولانا مفتی مجدالقدوس خبیب رومی صاحب اور مولانا حکیم فخرالاسلام مظاہری صاحب شامل ہیں۔ ان اہلِ علم نے بحیثیت مجموعی کتاب کو سراہا ہے اور اس کی اشاعت کو وقت کی اہم ضرورت قرار دیا ہے۔ بعض صاحبانِ علم نے مولف کی توجہ اس جانب مبذول کرائی ہے کہ وہ خود تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی پر ایک مفصل مضمون لکھیں۔ اس سلسلے میں مولف کا کہنا ہے کہ تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی پر کئی مبسوط کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

مثلاً 1۔ تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کیا ہے؟ از مولانا عمر فاروق، استاذ جامعۃ الرشید کراچی، مطبوعہ مکتبۂ نقشبندیہ طارق روڈ کراچی، 2۔ مولانا عبید اللہ سندھی اور تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی از مولانا عبدالحق خان بشیر، ناشر حق چار یار اکیڈمی مدرسہ حیات النبی گجرات، 3۔ تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی اور اس کی قیادت حقائق کے آئینے میں از مولانا ڈاکٹر عبدالحکیم اکبری، ناشر مکتبہ دیوبند ڈیرہ اسماعیل خان، اس لیے بظاہر اس موضوع پر کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اسی طرح متعدد اہلِ قلم نے بھی اپنے تبصروں میں بحیثیت مجموعی کتاب کی تحسین کی ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ ان اہلِ قلم کے تبصرے جن رسائل میں شائع ہوئے ان کی تفصیل اس طرح ہے: جناب شکیل عثمانی صاحب۔ ماہنامہ البلاغ کراچی، جناب حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب۔ ماہنامہ بیداری حیدر آباد، مولانا مفتی امجد حسین صاحب۔ ادارہ غفران راولپنڈی، ملک نواز احمد اعوان صاحب۔ ہفت روزہ فرائیڈے اسپیشل کراچی، احمد

حاطب صدیقی صاحب۔ روزنامہ جسارت (سنڈے میگزین) کراچی، پروفیسر ڈاکٹر محمد الغزالی صاحب۔ ماہنامہ البرہان لاہور، ڈاکٹر انوار احمد بگوی صاحب۔ ماہنامہ البرہان لاہور، سلطان محمد فاتح صاحب۔ روزنامہ جنگ (سنڈے میگزین) کراچی، ڈاکٹر شہزاد چنا صاحب۔ ہفت روزہ وینجھار [سندھی] حیدرآباد، ادارہ ششماہی نقطۂ نظر اسلام آباد۔ ان میں سے بعض تبصرے (مثلاً ششماہی نقطۂ نظر اسلام آباد کا تبصرہ) مولانا سندھی کی فکر پر مستقل مضمون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا مطالعہ عام قارئین کے لیے چشم کشا ثابت ہوگا۔

کتاب کے نئے ایڈیشن میں دوسرا اضافہ مفتی محمد رضوان صاحب کے مضمون ''حضرت مدنی اور حضرت تھانوی کے مولانا سندھی کے متعلق موقف پر شبہ کا ازالہ'' کی شمولیت ہے۔ مفتی صاحب اس مضمون میں لکھتے ہیں کہ اس کتاب کے پہلے ایڈیشن پر اہلِ علم اور اہلِ قلم حضرات کی جو آراء موصول ہوسکیں وہ زیرِ نظر ایڈیشن میں شامل کر لی گئی ہیں۔ ایک صاحب کی طرف سے مولانا سندھی کے بارے میں مولانا حسین احمد مدنیؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کے نقطۂ نظر پر دو شبہات ظاہر کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ مولانا سندھی کے متعلق حضرت مدنیؒ کی جو تحریر اس کتاب میں شامل کی گئی ہے، وہ حضرت مدنیؒ کی کتاب ''نقشِ حیات'' سے پہلے کی تحریر ہے اور ''نقشِ حیات'' میں حضرت مدنیؒ نے مولانا سندھی کی خدمات کا اعتراف کیا ہے، لہٰذا حضرت مدنیؒ کی طرف منسوب اس تحریر کا اعتبار نہیں کیا جائے گا اور یہ تحریر جھوٹی ہے جس کی اشاعت کے بعد حضرت مدنیؒ نے اس سے لاعلمی کا اظہار فرمایا تھا۔ دوسرے یہ کہ حضرت تھانویؒ نے موتمر الانصار کے ایک اجلاس کے خطبے میں فرمایا تھا کہ بیس صفحات پر مشتمل یہ خطبہ مولوی عبیداللہ سندھی کی توجہ اور برکت سے لکھا گیا جس سے معلوم ہوا کہ مولانا سندھی کی حضرت تھانویؒ نے بھی تعریف کی ہے۔ اس لیے حضرت تھانویؒ کے اس ملفوظ کا اعتبار نہیں کیا جائے گا جس میں حضرت نے اس کے برعکس رائے دی ہے۔

حضرت مدنیؒ کی تحریر کے بارے میں شبہ کا جواب دیتے ہوئے مفتی رضوان صاحب لکھتے ہیں

کہ یہ تحریر سب سے پہلے 17 مارچ 1945ء کے سہ روزہ مدینہ بجنور میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد حضرت مدنیؒ کی حیات میں مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتی رہی، یہاں تک کہ 1957ء میں حضرت کا انتقال ہوگیا۔ اگر حضرت مدنیؒ نے اس تحریر کی اشاعت کے بارے میں لاعلمی کا اظہار فرمایا تھا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب حضرت کو معلوم ہوگیا تھا کہ ان کے نام سے ایک جعلی مضمون مدینہ اخبار میں چھپا ہے تو انہوں نے تحریری طور پر اس کی تردید کیوں نہیں کی۔ وہ اپنی تردید جمعیت علمائے ہند کے ترجمان الجمعیت دہلی یا کسی اور اخبار یا رسالے میں شائع کرا سکتے تھے۔ پھر اس کے بعد اس تحریر کو مستند اکابر اور اہل علم کی طرف سے باحوالہ نقل کیا جاتا رہا۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ کے خلیفۂ اجل، مفتی عاشق الٰہی بلند شہری مہاجر مدنی نے اس تحریر کی عکسی نقل مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کو بھیجی جنہوں نے اسے من وعن دسمبر 1996ء کے ماہنامہ البلاغ کراچی میں شائع کیا۔ پشاور یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات کے سابق سربراہ اور مولانا مدنیؒ کے شاگرد مولانا عبدالقدوس قاسمی نے اپنی مرتّبہ ''مولانا عبیداللہ سندھی کی ذاتی ڈائری'' مطبوعہ 1946ء میں اس تحریر کو شامل کیا۔ اس تحریر کا اقتباس مولانا عبدالحمید سواتیؒ کی کتاب ''مولانا عبیداللہ سندھی کے علوم و افکار'' میں موجود ہے۔ یاد رہے کہ یہ کتاب مولانا سندھی کے دفاع میں لکھی گئی ہے۔ مولانا عبیداللہ سندھی کی فکر کے مداح اور ممتاز محقق، ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری صاحب نے اپنی کتاب ''امام عبیداللہ سندھی: حیات و خدمات'' کے پیش لفظ میں اس تحریر کے اقتباس کو شامل کیا ہے۔

''نقش حیات'' میں مولانا مدنیؒ نے تحریکِ آزادی ہند میں مولانا سندھی کے کردار کی تحسین کی ہے۔ اگر اس موقع پر وہ مولانا سندھی کے دینی افکار یا ذہنی کیفیت کا ذکر کرتے تو وہ بے محل ہوتا۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے 1912ء میں موتمر الانصار کے اجلاس میں ایک خطبہ پڑھا جس میں ارشاد فرمایا ''بیس صفحات پر مشتمل یہ خطبہ مولوی عبیداللہ سندھی کی توجہ کی برکت سے لکھا گیا۔ اس کے چاہے یہ معنی نہ ہوں کہ مولوی صاحب صاحبِ تصرف ہیں، لیکن یہ ضرور ہے

کہ صاحبِ خلوص ہیں''۔ اس خطبے کے حوالے سے اس شبہ کا اظہار کیا گیا ہے کہ اس میں مولانا تھانویؒ نے مولانا سندھی کی تعریف کی ہے، اس لیے اُس ملفوظ کا اعتبار نہیں ہوگا جس میں مولانا تھانوی نے مولانا سندھی پر تفسیر بالرائے کا الزام لگایا ہے۔ اس سلسلے میں مفتی رضوان صاحب کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اولاً تو یہ خطبہ اس دور سے پہلے کا ہے جب مولانا سندھی نے دہلی میں ایک ادارہ نظارۃ المعارف القرآنیہ قائم کیا تھا۔ یاد رہے کہ یہ ادارہ 1913ء میں قائم کیا گیا جہاں مولانا سندھی اپنے مخصوص انداز میں تفسیرِ قرآن پڑھاتے تھے۔ اسی مخصوص انداز کو مولانا تھانویؒ نے اپنے ملفوظ میں تفسیر بالرائے کہا ہے۔ ثانیاً اپنے خطبے میں مولانا تھانویؒ نے مولانا سندھی کو محض صاحبِ خلوص قرار دیا ہے۔ بعد میں اپنے ملفوظ میں انہوں نے مولانا سندھی کے طرزِ تفسیر سے اختلاف کرنے کے باوجود ان کو مخلص قرار دیا۔ چنانچہ ایک ملفوظ میں فرماتے ہیں:

> ''مولوی عبید اللہ [سندھی] صاحب مخلص تھے، مگر ایسے ہی تھے جیسے سرسید مخلص تھے۔ چنانچہ غدر کے بعد کے واقعات ان کے خلوص کے شاہد ہیں''۔ (کلمۃ الحق یعنی ملفوظاتِ اشرفیہ قسط ہشتم ص 129 تا 131)

حضرت کے اس ملفوظ سے یہ نتیجہ نکلا کہ ایک شخص صاحبِ خلوص ہونے کے باوجود تفسیر بالرائے کر سکتا ہے۔

خاتمہ کلام کے طور پر ہم یہ عرض کریں گے کہ زیرِ نظر کتاب میں فاضل مولف نے علماء اور دانش وروں کی ان تحریروں کو بڑے سلیقے سے مرتب کر دیا ہے، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وطن واپسی کے بعد مولانا سندھی نے جن اختلافی افکار و خیالات کا اظہار کیا وہ قرآن اور سنت کی بنیادی تعلیمات سے متصادم ہیں۔

(ہفت روزہ ''فرائیڈے اسپیشل'' کراچی، 22 تا 28 جولائی 2016ء)

مذکورہ بالا تبصرے پر استدراک

(از: محمد سفیر الاسلام)

ہفت روزہ فرائیڈے سپیشل کی 22 تا 28 جولائی 2016ء کی اشاعت میں مفتی محمد رضوان صاحب کی تالیف ’’مولانا عبیداللہ سندھی اور تنظیمِ فکرولی اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ‘‘ پر خاکسار کا ایک تبصرہ شائع ہوا ہے۔ تبصرے کی اشاعت کے بعد بعض قارئین نے کہا کہ اس کتاب میں مولانا کے بارے میں صرف دیوبندی علماء کی آراء دی گئی ہیں۔ انہوں نے سوال کیا کہ کیا دوسرے مکاتبِ فکر کے علماء نے مولانا سندھی کے افکار پر اظہارِ خیال کیا ہے؟ انہوں نے یہ سوال اس تناظر میں اُٹھایا کہ مولانا نے سیاسیات اور معاشیات کے علاوہ علم الکلام، تفسیر، حدیث، فقہ اور تصوف کے ان مسائل پر بھر پور گفتگو کی ہے جن میں ان کی آراء میں تفرّد پایا جاتا ہے۔ اُن قارئین کی خدمت میں عرض ہے کہ خاکسار کی معلومات کے مطابق ماضی قریب کے دو معروف اہل حدیث علماء نے مولانا سندھی کے افکار کے بارے میں اپنی آراء کا اظہار کیا جنہیں ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

بطور تمہید یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی (م: اگست 1944ء) کی کتاب ’’شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک‘‘ کی اشاعت کے بعد مولانا مسعود عالم ندوی (م: مارچ 1954ء) نے ماہنامہ معارف اعظم گڑھ (فروری، مئی 1943ء) میں اس پر ایک تبصراتی مقالہ لکھا۔ اس کے بعد مولانا سندھی کے معتمد شاگرد پروفیسر محمد سرور کی کتاب ’’مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے افکار و تعلیمات‘‘ شائع ہوئی۔ پروفیسر صاحب اس کتاب کی اشاعت سوم کے دیباچے میں لکھتے ہیں ’’یہ کتاب پہلی دفعہ 1943ء میں شائع ہوئی تھی۔ اُس وقت مولانا عبیداللہ سندھی زندہ تھے۔ انہوں نے اس کتاب کو پڑھا اور پسند فرمایا۔

واضح رہے کہ اس کتاب کے بقیہ ایڈیشن ’’مولانا عبیداللہ سندھی: حالاتِ زندگی، تعلیمات اور

سیاسی افکار'' کے عنوان سے شائع ہوئے۔ مولانا مسعود عالم ندوی نے اس کتاب کے پہلے ایڈیشن پر بھی ایک تبصراتی مقالہ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ میں لکھا۔ بعد میں یہ دونوں مقالے کتابی صورت میں ''مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر'' کے عنوان سے 1944ء میں پٹنہ سے شائع ہوئے۔ اس کتاب پر ایک مبسوط مقدمہ مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا۔ خاکسار کی معلومات کے مطابق کتاب کا دوسرا ایڈیشن 1985ء میں دارالدعوۃ السّلفیہ، شیش محل روڈ لاہور نے شائع کیا جس میں عرض ناشر حافظ صلاح الدین یوسف صاحب کا لکھا ہوا ہے، اس ایڈیشن میں ممتاز اہل حدیث عالم مولانا محمد عطاء اللہ حنیف (م:1987ء) کا مولانا مسعود عالم ندوی پر ایک مختصر مضمون ہے جس کے ضروری حصے ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔ مولانا عطاء اللہ حنیف، ''مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم'' کے زیرِ عنوان لکھتے ہیں۔

''آہ! کیسی یاد تازہ ہوئی غالباً 1944ء کا لگ بھگ ہوگا کہ مشہور دیو بندی عالم و مفکر مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کی کتاب ''شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک'' لاہور سے شائع ہوئی تھی جس میں شاہ ولی اللہ کے فکر کو اپنے مخصوص سیاسی نظریات کے سانچے میں ڈھالنے کے علاوہ شہیدینؒ کی تحریکِ جہاد کے سلسلے میں تاریخ نویسی کے بجائے ''تاریخ سازی'' سے کام لیا گیا تھا، خصوصاً مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ، صادقینِ صادق پورؒ، بعض اعاظم عُلمائے اہل حدیث ہندؒ اور امام شوکانیؒ وغیرہم کے بارے میں عجیب وغریب مغالطے پھیلانے کی کوشش کی گئی۔

اس کتاب کے مستشرقانہ قسم کے مندرجات پر ایک ندوی فاضل کے قلم سے مجلّہ ''معارف'' اعظم گڑھ (ہند) کے چند شماروں میں بھر پور علمی اور تحقیقی تنقید شائع ہوئی جسے حلقۂ علمائے حق میں بہت پسند کیا گیا۔ یہ فاضل ندوی مولانا مسعود عالم ندویؒ تھے جو ان دنوں عظیم آباد پٹنہ (ہند) کی مشہور خدا بخش لائبریری

میں فہرست مرتب کرنے کی غرض سے مقیم تھے۔

اسی اثناء میں ''مولانا عبیداللہ سندھی کے افکار وتعلیمات'' کے عنوان سے ایک دوسری ایسی کتاب طبع ہوگئی جو دینی لحاظ سے انتشارِ فکری کا شاہکار تھی۔اس کا بھی مرحوم ہی نے غیرتِ دینی سے بے قرار ہوکر'' ناقدانہ جائزہ'' لے ڈالا جو ''معارف'' ہی (غالباً 1944ء کے آخری کسی مہینے) میں اشاعت پذیر ہوا۔

راقم السطوران دنوں فیروز پورشہر (مشرقی پنجاب) میں تھا۔ارادہ ہوا کہ ''معارف'' کے ان بلند پایہ مقالات کو کتابی صورت میں شائع کردیا جائے تاکہ ان کی افادیت کو عمومیت و پائندگی حاصل ہوجائے۔گو سابق تعارف نہ تھا تاہم خط وکتابت کی گئی۔موصوف نے نفسِ تجویز سے اتفاق کیا لیکن طے یہ پایا کہ کتاب مؤلف کی زیرنگرانی پٹنہ میں طبع ہو،جس کے اخراجات ہماری طرف سے پٹنہ روانہ کردیئے جائیں۔چنانچہ رقم بھیج دی گئی اور چند ماہ کے بعد علامہ سید سلیمان ندویؒ کے بصیرت افروز مقدمہ کے ساتھ''مولانا سندھی' اوران کے افکار وخیالات پرایک نظر'' نام سے 164 صفحات پر مشتمل ایک کتاب منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوگئی،وَللہ الحمد،جس پر 25 رمضان المبارک 1363ء تاریخ مندرج ہے۔ کتاب میں وہ خط وکتابت بھی شامل کردی گئی جواس دوران صاحبِ مقالات اور مولانا سندھی کے درمیان ہوچکی تھی۔(ہفت روزہ''الاعتصام' لاہور 10 ستمبر 1971ء)

ایک اور معروف اہل حدیث عالم حافظ محمد گوندلوی (م: 1985ء) نے''دوامِ حدیث'' کے عنوان سے دوجلدوں میں ایک کتاب لکھی ہے۔اس کا مرکزی موضوع حجیتِ حدیث ہے۔اس کتاب کا پسِ منظر یہ ہے کہ 1953ء میں ادارۂ طلوعِ اسلام نے''مقامِ حدیث'' کے عنوان سے ایک کتاب شائع کی تھی جس میں جناب غلام احمد پرویز،مولانا اسلم جیراج پوری اور مولانا تمنا عمادی کے حدیث پر مضامین ہیں۔ادارۂ طلوعِ اسلام کا حجیتِ

حدیث وسنت پر موقف اظہر من الشمس ہے۔ ''دوامِ حدیث'' اسی کتاب ''مقامِ حدیث'' کا جواب ہے۔ کتابی شکل میں شائع ہونے سے قبل حافظ محمد گوندلوی صاحب کے یہ جوابی مضامین ہفت روزہ الاعتصام، ماہنامہ رحیق اور ماہنامہ ترجمان الحدیث میں بالاقساط شائع ہوئے تھے۔

ادارۂ طلوعِ اسلام کی شائع کردہ کتاب ''مقامِ حدیث'' میں ماہنامہ الفرقان بریلی کے شاہ ولی اللہ نمبر میں مولانا عبید اللہ سندھی کے مضمون بعنوان ''امام ولی اللہ کی حکمت کا اجمالی تعارف'' کا درج ذیل اقتباس نقل کیا گیا ہے۔

''واضح رہے کہ جب اساسی قانون پر عمل درآمد شروع ہوتا ہے تو مخاطبین کی حالت کے مطابق چند تمہیدی قوانین بنائے جاتے ہیں۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ قانونِ اساسی غیر متبدل ہوتا ہے اور تمہیدی قوانین ضرورت کے وقت بدل سکتے ہیں۔ ہم سنت اُن تمہیدی قوانین کو کہتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد خلفائے ثلاثہ نے مسلمانوں کی مرکزی جماعت کے مشورہ سے تجویز کیے۔ خلافتِ عثمانیہ کے بعد یہ نظام ٹوٹ گیا کہ تمام کام مشورے سے کئے جائیں۔ سنت کو ہمارے فقہائے حنفیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین میں مشترک مانتے ہیں۔ اور یہی ہماری رائے ہے۔ اور یہ سنت قرآن ہی سے پیدا ہوگی۔ آج کل کی اصطلاح میں اس کو بائیلاز کہا جاتا ہے۔ اصل قانونِ اساسی متعین ہے۔ بائیلاز اُس وقت اور تھے اِس وقت اور ہوں گے جن میں زمانہ کے اقتضا آت کے مطابق فروعی تبدیلیاں ہوں گی۔ نئی نئی پیش آمدہ صورتوں کے متعلق تفصیلی احکام کا استخراج ہوگا اور اس کا نام فقہ ہے'' (ص264)

ادارہ طلوعِ اسلام اس اقتباس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے حکومتِ الٰہیہ کے قیام میں باہمی مشاورت سے قرآن کریم کی روشنی مین جو تمہیدی قوانین (بائیلاز)

مرتب فرمائے' ان کا نام سنت ہے۔ یعنی اُس زمانے کی فقہ۔ یہ بائیلاز ہر زمانہ میں بدلتے رہیں گے۔ لیکن اصل قانون (قرآن کریم) اساسی حیثیت سے مستقل رہے گا۔

حافظ محمد گوندلوی صاحب نے اپنی کتاب ''دوامِ حدیث'' میں ''مولانا عبید اللہ سندھی کے مغالطات'' کے زیرِ عنوان مولانا سندھی کے حدیث اور سنت کے بارے میں نظریات کی تردید کی ہے۔ یہ تردید صفحہ نمبر 349 سے 371 کو محیط ہے۔ مضمون کے آخر میں حافظ صاحب خلاصۂ بحث کا عنوان قائم کر کے لکھتے ہیں۔ ''سندھی صاحب کے مضمون میں بہت سے امور خلاف واقع ہیں، جو مندرجہ ذیل ہیں۔

(1) شاہ ولی اللہ صاحب کی طرف یہ نسبت کرنا کہ کل سنت قرآن سے مستنبط ہے، غلط ہے۔

(2) سنت صرف اتفاق یا اغلبیت کے فیصلوں کو قرار دینا' صحیح نہیں۔

(3) سنت کو بالکلّیہ وقتی قرار دینا' درست نہیں ہے۔

(4) سندھی صاحب کے کلام میں تعارض ہے۔ کبھی سنت سے حدیث مراد لیتے ہیں اور کبھی صرف باہمی مشورے سے متفقہ یا اغلبیت کے فیصلوں کو سنت قرار دیتے ہیں۔

(5) کبھی سنت کو وحی باطنی اور وحی غیر متلو کہتے ہیں، جس کا مطلب صرف یہ ہے کہ [یہ] دین ہے، اور کبھی مجلسِ شوریٰ کے فیصلوں کا نام رکھتے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کہ [یہ] دین نہیں ہے۔ (ص 366)

خاتمۂ کلام کے طور پر خاکسار یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ وہ علومِ اسلامیہ کا محض ایک طالب علم ہے۔ اور اہل علم ہی اس بحث کا محاکمہ کر سکتے ہیں۔ بہر حال بادی النظر میں حافظ محمد گوندلوی صاحب کے اعتراضات میں وزن ہے۔

(ہفت روزہ ''فرائیڈے اسپیشل'' کراچی، 29 جولائی تا 04 اگست 2016ء)

اشاعتِ دوم پر ماہنامہ ''الشریعہ'' کا تبصرہ

(از: مولانا سید متین احمد شاہ)

2014ء میں مولانا عبید اللہ سندھی اور تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کے حوالے سے ''مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ'' نامی کتاب شائع ہوئی، جس کے مؤلف جناب مفتی محمد رضوان ہیں۔ یہ کتاب اصل میں مولانا سندھی کے بارے میں مختلف اہلِ علم کی ناقدانہ آرا اور تنظیم فکر ولی اللّٰہی کے نظریات پر علماء کے فتووں کا ایک تالیفی مجموعہ ہے۔ اس کتاب کا حال ہی میں دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہوا ہے، جس کے تقریباً تمام مندرجات پہلے ایڈیشن والے ہیں، البتہ اس میں پہلے ایڈیشن پر ہونے والے بعض تبصرے شامل کیے گئے ہیں، جن میں سب سے مبسوط تبصرہ انسٹی ٹیوٹ آف پالسی اسٹڈیز کے مؤقر جریدے نقطہ نظر (شمارہ 37، اکتوبر 2014ء --- مارچ 2015ء) کا ہے۔ اس تبصرے میں مولانا کے فکری پس منظر کو بڑی جامعیت کے ساتھ عہد بہ عہد دیکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کتاب کے بعض اندراجات کے بارے میں قارئین کے سوالات کے جوابات بھی نئی اشاعت میں شامل کیے گئے ہیں۔

کتاب کا پہلا حصہ ''مولانا عبید اللہ سندھی کے متعلق اکابر علماء کا موقف'' ہے۔ اس میں مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا مفتی تقی عثمانی، مولانا مفتی عبدالواحد، مولانا ابن الحسن عباسی، جناب شکیل عثمانی، مولانا موسیٰ بھٹو اور بعض دیگر اہلِ علم کے مقالات اور آرا جمع کی گئی ہیں، جن میں مولانا عبید اللہ سندھی کے افکار پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے۔ یہ حصہ مرتب کی محنت اور کاوش کا ثبوت ہے کہ موضوع سے متعلق مواد کو پہلی بار اس طور

پر یک جا کیا ہے۔ جس کی تلاش اور دست یابی اس سے پہلے اتنی آسان نہیں تھی۔

مولانا عبید اللہ سندھی کی شخصیت وافکار کے حوالے سے کوئی حتمی رائے قلم بند کرنا راقم کے لیے ذرا مشکل معاملہ ہے، اور اس کی وجہ ان کے حوالے سے پائے جانے والے مختلف افکار و آرا ہیں، جن پر نظر ڈالی جائے، تو ہمارے سامنے تین قسم کی آرا آتی ہیں:

ایک نقطۂ نظر کی رُو سے مولانا عبید اللہ سندھی کی فکر جمہور علمائے امت کی فکر سے جدا ہے (اور یہی حکم تنظیم فکر ولی اللّٰہی کا ہے) زیرِ تبصرہ کتاب کے مؤلف کا نقطۂ نظر یہی ہے، اور اسی کی تائید کرنے والی تحریرات کو اس میں جمع کیا گیا ہے، یہ نقطۂ نظر ان کی اپنی زندگی میں لکھی گئی یا دیگر مرتبین کی مرتب کردہ کتابوں کی روشنی میں بنتا ہے۔

دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مولانا (سندھی) کی فکر میں اگرچہ شاذ امور بھی پائے جاتے ہیں، تاہم بحیثیتِ مجموعی وہ کتاب وسنت کی ہی ترجمان ہے۔ اس نقطۂ نظر کے حاملین کے نزدیک مولانا سندھی کی طرف بعض افکار اور تحریریں غلط طور پر بھی منسوب ہیں، جن کی ذمہ داری ان پر نہیں آتی، بلکہ ان کے تلامذہ اس کے ذمہ دار ہیں، تاہم ان حضرات کے نزدیک تنظیم فکر ولی اللّٰہی کے افکار درست نہیں ہیں۔ اس رجحان کے قائل مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا صوفی عبدالحمید سواتی، مولانا زاہد الراشدی اور مولانا عبدالحق خان بشیر وغیرہم ہیں۔

مولانا صوفی عبدالحمید سواتی لکھتے ہیں:

> ’’انصاف کی بات یہ ہے کہ حضرت مولانا عبید اللہ سندھی کے بعض افکار شاذ بھی ہیں، بعض مرجوح قسم کے خیالات بھی ہیں، اور بعض باتیں ایسی ہیں کہ مولانا ان پر بے جا سختی بھی کرتے تھے، بعض باتیں مصلحت کی خاطر بھی ناگزیر خیال کرتے تھے اور بہت سی باتیں ایسی بھی ہیں جن کی نسبت ان کی طرف کرنے میں ان کے تلامذہ نے غلطی کی ہے۔ اس کی ذمہ داری حضرت مولانا پر نہیں، بلکہ ان کے ناقلین پر ہے، جنھوں نے ان باتوں کو نقل کیا ہے، اور شاید سابق لاحق سے قطع نظر

کر کے حضرت مولانا سندھی کا مطلب بھی نہیں پا سکے۔ بہر حال خیالات وافکار کا شذوذ تو ہر مجتہد اور محقق میں پایا جاتا ہے، لیکن بایں ہمہ مولانا سندھی اپنے مسلک، عقیدہ اور عمل کے لحاظ سے پکے سچے راسخ العقیدہ اور پر جوش مسلمان تھے"۔(1)

مولانا عبدالحق خان بشیر نے 2004ء میں ایک کتاب "مولانا عبیداللہ سندھی اور تنظیمِ فکرِ ولی اللہی" کے نام سے تحریر کی تھی، جس کا بنیادی مقدمہ یہی ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی کے افکار کو ان کے ناقل شاگردوں نے غلط طور پر پیش کر دیا ہے، جس کے نتیجے میں ان کی فکر یگانوں اور بیگانوں کے ہاں متنازع بن کر رہ گئی۔ اس کتاب کا مقدمہ مصنف کے بھائی مولانا زاہد الراشدی نے تحریر کیا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں: "بدقسمتی سے مولانا سندھی کے خوشہ چین، جنہوں نے اپنے استاد کی پیروی میں کمیونسٹ انقلاب اور نظام کے مطالعہ کی زحمت تو اٹھالی، لیکن ان کی طرح فکری ونظریاتی توازن قائم نہ رکھ سکے، خود پر "لغزشِ پا" کا الزام زیادہ بوجھل سمجھتے ہوئے انہوں نے اسے اپنے استاد کی طرف منتقل کر دینے میں عافیت محسوس کی اور یہ بات ناقدین کے بے رحم ہاتھوں میں پہنچ کر ایک نئے فکری معرکے کا عنوان بن گئی۔"(2)

اس کتاب میں بڑی تفصیل کے ساتھ مولانا سندھی کا دفاع کیا گیا ہے، اور اس کے لیے مختلف عقلی اور نقلی معیارات وضع کیے گئے ہیں، جن پر، مصنف کے بہ قول، مولانا سندھی کی فکر کو پرکھا جاسکتا ہے۔ ایک عنوان "امام سندھی کی فکری صحت پر ٹھوس شہادتیں" قائم کر کے مختلف علما کی طرف سے مولانا سندھی کو پیش کیا گیا خراجِ عقیدت بھی مصنف نے نقل کیا ہے۔ ان علما میں مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا احمد علی لاہوری جیسے اہلِ علم کا نام بھی شامل ہے، تاہم یہ نام پیش کرنے میں جو چیز نظر انداز ہوئی ہے، وہ مولانا سندھی کی فکر کے زمانی مدارج ہیں۔ مولانا تھانوی اور مولانا لاہوری کی طرف سے بلاشبہ حضرت سندھی کے حق میں بلند پایہ اظہارِ عقیدت بھی ملتا ہے، اور یہ بات صرف انہی دو علما پر بس نہیں، علمائے دیوبند میں سے دیگر حضرات کے ہاں بھی یہ جذبات موجود ہیں، لیکن خود انہی علما کی تصریحات کے مطابق

اصل مسئلہ وہاں سے شروع ہوتا ہے، جب مولانا سندھی افغانستان، سوویٹ یونین، ترکی اور حجاز کے قیام کے بعد 1939 میں ہندوستان پہنچے، تو ان کی تقاریر اور تحریروں میں پیش کیے جانے والے خیالات سے علما کو اختلاف ہونا شروع ہوا۔(3)

اگرچہ دیوبند میں قیام کے دوران میں اس سے بہت پہلے بھی مولانا سندھی کے بعض امور پر اختلافات سامنے آ چکے تھے، لیکن ان کی فکر میں نمایاں اور جوہری تبدیلیوں کا تعلق سفر کابل کے بعد کا ہے، مولانا تھانوی کی جو تحریر اس سلسلے میں پیش کی گئی ہے، وہ 1912ء کی ہے، جب کہ مولانا سندھی کے افکار کے شاذ امور سامنے آنے کے بعد مولانا تھانوی کے ملفوظات وغیرہ میں ان پر تنقید بھی ملتی ہے۔

اس کتاب کے مؤلف نے ایک عنوان ''امام سندھی کے ناقابلِ اعتماد تلامذہ'' کے الفاظ میں باندھا ہے، جس کے تحت مولانا لاہوری، خواجہ عبدالحی فاروقی وغیرہ کو قابل اعتماد جبکہ موسیٰ جار اللہ اور مولانا عبداللہ لغاری کو ان کے ناقابل اعتماد تلامذہ میں شمار کیا ہے۔ ان حضرات کے ساتھ پروفیسر محمد سرور کا نام نقل نہیں کیا گیا، حالاں کہ ہندوستان میں مولانا سندھی کے افکار پر جو تنقید ہوئی ہے، زیادہ تر ان تحریروں کی روشنی میں ہوئی ہے، جو پروفیسر محمد سرور کی مرتب کی ہوئی ہیں۔ مولانا عبیداللہ سندھی کی زندگی ہی میں ان کی معروف کتاب ''افادات وملفوظات'' شائع ہوئی تھی۔ ان کی ایک دوسری کتاب ''مولانا عبیداللہ سندھی: حالات، تعلیمات اور سیاسی افکار'' کے نام سے ہے۔ مولانا سندھی کی فکر پر جو اشتراکیت، وحدتِ ادیان، تشریعات کے غیر ابدی ہونے جیسے مسائل کے حوالے سے سب سے زیادہ تنقید ہوئی ہے، وہ افکار پروفیسر محمد سرور کی انہی کتابوں سے اٹھائے گئے ہیں۔ دوسری طرف ان کے بارے میں ایسے علما کے بلند پایہ الفاظ موجود ہیں۔ جو مولانا سندھی کی فکر کے سب سے بڑے خوشہ چین اور ان کے عقیدت مند کہلاتے ہیں۔ مثال کے طور پر مولانا احمد علی لاہوری کے بیٹے مولانا عبیداللہ انور کے قلم سے پروفیسر سرور کے بارے میں ایک مضمون ہے، جس کے بعض

مندرجات یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

''خود سرور صاحب کی تصنیف ارمغان شاہ ولی اللہ اپنے موضوع پر بے نظیر کتاب ہے۔ جسے شاہ ولی اللہ کی کتابوں کا خلاصہ اور نچوڑ کہنا چاہئے، اور علومِ قرآنی کے طلبہ کے لیے تو وہ ایک نعمت ہے۔ ایسے ہی مولانا سندھی پر ''افادات وملفوظات'' اور ''مولانا عبیداللہ سندھی'' نام کی دو کتابیں لکھ کر تو انہوں نے امت پر احسانِ عظیم کیا ہے۔''...... ''ملک نصراللہ خان عزیز نے مولانا سندھی سے پوچھا، اس کتاب کے بارے میں خود آپ کی کیا رائے ہے؟ مولانا نے فرمایا: ''پروفیسر صاحب نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ میرے افکار وخیالات سے متصادم کوئی چیز اس میں نہ آنے پائے۔ ظاہر ہے خیالات تو میرے ہی ہیں، لیکن زبان و بیان سرور صاحب کا ہے''...... ''بہرحال میں قدرت کی اس بے نیازی پر حیران ہوں کہ علم وادب کی یہ عظیم خدمت اس نے کس کے سپرد کی، جس کا کوئی علمی پس منظر نہیں۔ سرور صاحب کا تعلق گجرات کے ایک گھرانے اور پس ماندہ علاقے سے ہے''...... ''سرور صاحب کا تعلق تو پرانی نسل سے تھا، لیکن لکھتے وہ نئی نسل کے لیے تھے، اور زیادہ تر فائدہ بھی اس سے آئندہ نسلیں ہی اٹھائیں گی۔ میرا خیال ہے مستقبل میں ان کی تحریریں اور مقبول ہوتی چلی جائیں گی کیوں کہ یہ کوئی وقتی باتیں یا سطحی نظریات نہیں۔ یہ دراصل مولانا سندھی کے برسوں کے تجربات اور شاہ ولی اللہ کی مجتہدانہ تعلیمات پر مبنی ہیں۔''...... ''سرور صاحب فطرت کا ایک عطیہ تھے، جن کی دریافت مولانا سندھی ہیں، اور مولانا سندھی نے ہمارے لیے شاہ ولی اللہ کو دریافت کیا، اور شاہ ولی اللہ نے خیرالقرون سے لے کر اپنے دور تک اسلام کی فلاسفی کو جس طرح مدون کیا ہے، اس کی مثال نہیں ملتی''(4)

ان اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر سرور نہ صرف مولانا سندھی کے ہاں معتمد علیہ شخصیت تھے، بلکہ بعض دیگر ثقہ علما کی رائے بھی ان کے بارے میں نہایت مثبت تھی، نیز یہ کہ انہوں نے مولانا سندھی کے افکار کو منتقل کرنے میں کسی علمی خیانت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ یہی

خیال جناب سید خالد جامعی کا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کے بارے میں ہمارے محترم کفیل بخاری صاحب اور عابد مسعود صاحب کی رائے ہے کہ پروفیسر سرور کی محرف تحریروں کے باعث مولانا سندھی کے افکار کا غلط خاکہ تیار ہوا ہے۔ ساحل کا بھی یہی موقف تھا، لیکن جب اس سلسلے میں ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری سے رابطہ کیا، تو انہوں نے واضح دوٹوک الفاظ میں فرمایا کہ پروفیسر سرور نے مولانا سندھی کے حوالے سے جو کچھ تحریر فرمایا ہے، وہ مولانا سندھی کے افکار کی درست ترجمانی ہے۔ اس میں کوئی تحریف، اضافہ، سرور صاحب سے منسوب کرنا درست نہیں۔ مولانا سندھی کے یہی افکار تھے۔'' (5)

تیسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مولانا سندھی کی جملہ تحریرات وافکار ان کی اپنی ہی ہیں، اور کوئی چیز ان کی طرف غلط منسوب نہیں ہے۔ یہ نقطۂ نظر ان کے جملہ افکار کا مؤید اور داعی ہے۔ یہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری اور تنظیم فکر ولی اللّٰہی کا رجحان ہے، اور ان حضرات نے علماء کی طرف سے دیئے گئے فتووں کا جواب اور اپنے نظریات کی وضاحت بھی کی ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں جیسا کہ ذکر ہوا، پہلے نقطۂ نظر کے حوالے سے تحریرات جمع کی گئی ہیں۔
مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے پروفیسر محمد سرور کی کتاب ''مولانا عبیداللہ سندھی: حالات، تعلیمات اور سیاسی افکار'' پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا سندھی کی فکر کے قابلِ تنقید امور پر نقد کرتے ہوئے لکھا تھا:

''مولانا مرحوم کی یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ ان کا تعلق علمائے کرام کے اس طبقہ سے تھا، جو اپنی گروہ بندی کی عصبیت میں حدِ کمال پر پہنچا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا یہ سب کچھ فرما گئے، اور لکھوا اور چھپوا بھی گئے، اور پھر بھی تنقید کی زبانیں بند اور تعریف کی زبانیں تر رہیں، ورنہ اگر انہوں نے اس طبقہ خاص سے باہر جگہ پائی

ہوتی، تو ان کا استقبال سرسید اور ”علامہ“ مشرقی سے کچھ کم شاندار نہ ہوا ہوتا۔(6)

تاہم زیرنظر کتاب مولانا مودودی کی اس بات کی تردید کرتی ہے، کیوں کہ اس میں شامل تقریباً تمام مقالات علمائے دیوبند کے ہیں جس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے دینی مکاتب فکر میں خود احتسابی اور تنقید کی روایت زندہ رہی ہے، اور محض عقیدت مندی کی بنا پر اپنے حلقے کے بزرگوں کے قابلِ نقد افکار پر پردہ نہیں ڈالا گیا، بلکہ ان پر علمی تنقید ہوتی رہی ہے۔ یہ نکتہ اور یہ پہلو سامنے رکھنا اس لیے ضروری ہے کہ دینی حلقوں پر ایک عمومی الزام ہے کہ وہ اپنے بڑوں کی اندھی تقلید یا رائج اصطلاح میں ”اکابر پرستی“ میں مبتلا ہوتے ہیں۔

مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مسعود عالم ندوی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

”آپ نے سچ کہا، مولانا شبلی کی پیش گوئی کہ آخر دیوبند بھی کب تک دیوبند رہے گا، برہان (7) والوں کے مضامین نے اسی کا ثبوت بہم پہنچایا۔ حضرت شاہ (ولی اللہ) صاحب کے ان ہی خیالات کی اس تشریح کو اگر سرسید اور شبلی کا قلم بیان کرے، تو بے دینی، اور اگر فضلائے دیوبند لکھیں، تو عین دین۔ بسوخت عقل از حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست“۔(8)

اسی طرح مولانا مناظر احسن گیلانی (جو کہ دیوبند کے جلیل القدر عالم ہیں) نے مولانا عبدالماجد دریابادی کے ہفت روزہ ”صدق“ میں مولانا سندھی کے حوالے سے ایک تنقیدی خط لکھا، اور مولانا سندھی کا دفاع کرنے والے دیوبندی حلقہ فکر کے لوگوں پر ذرا سخت الفاظ لکھے ہیں۔(9)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی کے افکار پر احتساب کا معاملہ دیوبند کے اہلِ علم کے ہاں قابل چشم پوشی نہیں رہا، بلکہ انہوں نے اس کا بھرپور ثبوت دیا ہے، اور اس کا سب سے بڑا شاہد یہی زیر تبصرہ کتاب ہے۔

اس کتاب میں مولانا اشرف علی تھانوی کا ایک تنقیدی مضمون بھی شامل ہے، جو اصلاً تو اس

وقت مولانا لاہوری کی تفسیر پر تنقید کے سلسلے میں سامنے آیا، لیکن وہ افادات مولانا سندھی ہی کے تھے۔ مولانا سندھی کے افکار میں جب تک شاذ امور داخل نہ ہوئے تھے، مولانا تھانوی نے ان سے اپنی عقیدت کا اظہار اچھے الفاظ میں کیا تھا، تاہم مولانا سندھی کے افکار میں شذوذ کے ظہور کے بعد مولانا تھانوی کے کلام میں ان پر تنقیدیں ملتی ہیں، جن کا ایک حصہ اس کتاب کا جزو ہے، کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں کسی سائل کے اعتراض پر مؤلف نے مولانا تھانوی کے وہ الفاظ بھی نقل کیے ہیں، اوران کی توجیہ یہ پیش کی ہے کہ یہ اظہارِ عقیدت اس دور کا ہے، جب کہ مولانا سندھی کے افکار میں شاذ باتیں نمایاں نہیں ہوئی تھیں۔ (10)

مولانا عبید اللہ سندھی کے فکر کے جو اجزا علما کے نزدیک محل نظر رہے ہیں، اور جن کی تائید کتاب میں شامل تحریروں سے ہوتی ہے، ان مقالات پر ایک مجموعی اور کلی نظر ڈالی جائے، تو ان میں سے ضروری اور بڑے بڑے امور کو مندرجہ ذیل نکات کی شکل میں بیان کیا جاسکتا ہے:

1۔ تفسیر قرآنی میں تفسیر بالرائے کا رجحان

2۔ اشتراکیت اور نیشنل ازم کا تاثر

3۔ وحدتِ ادیان کا تصور

4۔ قادیانیت کے بارے میں نرم گوشہ

5۔ تشریعی احکام (خصوصاً حدود وغیرہ) کی زمانیت اور ابدیت

6۔ بعض کلامی امور (جیسے نزولِ عیسیٰ، عذابِ فاسقین، کفار کا خلود فی النار وغیرہ) کے بارے میں تفردات

اس کے علاوہ بھی مختلف نکات ذکر کیے جاسکتے ہیں، لیکن جناب مفتی محمد رضوان کی زیرِ تبصرہ کتاب کے اکثر مقالات انہی امور کے گرد گھومتے ہیں۔

پہلے نکتے کے لحاظ سے زیرِ تبصرہ کتاب میں مولانا اشرف علی تھانوی کا ایک رسالہ ”التقصیر

فی التفسیر" شاملِ اشاعت ہے، یہ رسالہ مولانا نے 1347ھ میں تصنیف فرمایا تھا، اس وقت مولانا عبید اللہ سندھی حیات تھے، یہ رسالہ بعد میں طبع نہیں ہوا۔ (11) اس رسالے میں مولانا تھانوی نے مولانا عبید اللہ سندھی کے ان تفسیری افکار پر نقد کیا ہے، جو وہ جدید مسائل کے استنباط کے معاملے میں قرآن سے پیش کیا کرتے تھے۔ سیاسی اور اقتصادی مسائل کے باب میں مولانا سندھی صوفیہ کے طریق پر تاویل اور اعتبار سے کام لیتے ہوئے قرآنی آیات سے "تفسیر اشاری" کے مسائل کا استنباط کیا کرتے تھے، تاہم اس طرز کو مولانا تھانوی نے تفسیر بالرائے کی قبیل سے دیکھا ہے، اور اس پر نقد کیا ہے۔

یہ رسالہ ایک مقدمے اور تین فصلوں پر مشتمل ہے، مقدمے میں بعض اصولی باتیں ذکر کی ہیں، جن میں دلالت کی انواع اور جائز و ناجائز استنباطات کا ذکر ہے، فصل دوم میں قرآن کے اصل مقصود اور اس کی غرض و غایت پر گفتگو کی گئی ہے، تیسری فصل میں مولانا سندھی کی تفسیراتِ اعتباریہ میں سے تقریباً اکیس نمونے نقل کر کے ان پر تنقید کی گئی ہے۔

مولانا سندھی کے یہ استنباطات کس طرح صوفیہ کی تفسیر اشاری سے جدا ہیں، اور غیر مطلوب فی الدین ہیں؟ اس کی وضاحت میں مولانا تھانوی نصوص کی دلالت کی مختلف صورتوں کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جن احکام کو نصوص کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، وہ دو قسم کے ہیں: ایک قسم معتبر دلالتوں کی ہے، اگر وہ واضح ہو تو وہ تفسیر ہے، خواہ قطعی ہو یا ظنی اور استنباطاً ہو تو اس کا نام فقہ و اجتہاد ہے۔ دوسری قسم وہ ہوتی ہے جو دلالت سے تو تعلق نہیں رکھتی، لیکن ان احکام کی نصوص کے مدلولات سے ایک گونہ مشابہت ہوتی ہے۔ اس قسم کے احکام کو مدلولِ نص کہنا درست نہیں ہے، ورنہ یہ تفسیر بالرائے ہے۔ رہا اس کا جواز اور عدمِ جواز تو ایسی چیزیں اگر دین میں مطلوب ہوں، تو ایسے احکام کا ذکر کرنا جائز ہوگا، جیسے تفسیر اشاری صوفیہ کے ہاں ملتی ہے، لیکن اگر یہ دین میں مطلوب نہ ہوں، تو پھر ان احکام کا ذکر ان نصوص کے ذیل میں ناجائز ہوگا۔ مولانا تھانوی نے مولانا سندھی کی جن باتوں پر نقد کیا ہے، ان میں

سے زیادہ تر اسی آخری قسم سے تعلق رکھتی ہیں۔(12)

اس کی ایک مثال: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وان اردتم ان تسترضعوا اولادکم فلا جناح علیکم** (13) (اور اگر تم اپنی اولاد کو دودھ پلوانا چاہو، تو تم پر کچھ گناہ نہیں (یعنی کوئی دودھ پلانے والی بلا کر)۔

اس آیت کے تحت ''اعتبار'' کے طور پر مولانا سندھی نے لکھا ہے کہ ''اگر از ممالک خارجہ کساں برائے ترتیب نہر وغیرہ قوم خود طلبانیدہ شود درست است۔'' (اگر بیرون ممالک سے حکومت اپنے ہاں نہری اور آب پاشی کے نظام کے اجرا اور ترقی کے لیے ماہرین بلائے تو درست ہے) اس پر مولانا تھانوی نے تنبیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس عبارت کے متعلق مقدمہ میں بھی کچھ لکھا گیا ہے اور اس میں ایک خاص خبط (یعنی بدعقلی کا مظاہرہ) بھی کیا گیا ہے کہ مطلق رعیت کو جو کہ قدیم (یعنی پرانی رعایا) کو بھی شامل ہے۔ بجائے اولاد کے قرار دیا ہے اور عبارت پانزدہم (یعنی پندرہویں عبارت) میں صرف نئی رعیت کو بجائے اولاد کے قرار دیا گیا تھا۔ اس کا مقتضاء یہ ہے کہ اس آیت میں صرف جدید رعیت کی مصالح کے لئے غیر ملکی لوگوں کو بلانا جائز ہو اور اگر مختلف اعتبارات کی بنا پر سب تشبیہات کی تصحیح کی جاوے تو دوسرے شخص کو جائز ہوگا کہ دوسرے اعتبارات فرض کر کے ان احکام کے مضاد (یعنی مخالف) احکام قرآن سے مستنبط کرے، تو قرآن کیا ہوا موم کی ناک ہوئی۔ نعوذ باللہ۔'' (14)

مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا سندھی کی ''قرآن کی سیاسی تعبیر'' پر نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ نظارۃ المعارف القرآنیہ کے تحت انگریزی و عربی کے فارغ التحصیل اور نیم فارغ التحصیل لوگوں میں ''درس (قرآن) کا منشا یہ تھا کہ پورے قرآن کو جہاد و سیاست ثابت کیا جائے، اور تمام احکام کو اس جنگی رنگ میں پیش کیا جائے۔ اس تفسیر کی جھلک آپ کو ان کے تلامذہ مثلاً خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی کی تفسیر اور مولانا احمد علی صاحب لاہوری کے قرآنی

حواشی میں پوری طرح نظر آئے گی۔" (15) غالباً انہی تنقیدوں کا محرک تھا کہ اس تفسیر پر بعد میں دیوبند کے کئی علما کی تقاریظ لی گئیں، جن میں اس کے حق میں تائیدی اور تعریفی کلمات کہے گئے ہیں۔

مولانا سندھی کی فکر میں جن امور پر سخت تنقیدیں ہوئی ہیں، ان میں وحدتِ ادیان کی فکر کا عنصر بھی ہے، کتاب میں شامل مقالات میں مولانا مسعود عالم ندوی کے مقالے میں درج ہے کہ "مولانا سندھی اسلام اور ہندوستانی قومیت کا ایک معجونِ مرکب پیش کرنا چاہتے ہیں، تاکہ ہندوؤں کو اسلام سے وحشت نہ رہے، اور مسلمان خوشی خوشی ہندوستانی قومیت کا جزو بن سکیں۔ اسی اعتبار سے وہ وحدتِ انسانیت اور وحدتِ ادیان کے قائل ہیں۔ مولانا کے نزدیک قرآن مجید بھی اسی بنیادی فکر کا ترجمان ہے" (16) اسی طرح مولانا ابن الحسن عباسی، مولانا سندھی کی تفسیر الہام الرحمان کا حسبِ ذیل اقتباس پیش کر کے کہتے ہیں کہ مولانا وحدتِ ادیان کی فکر کے قائل ہیں:

> "ہم تمام ادیان کی حقانیت اور صحت کا اعتراف کرتے ہیں، لیکن صرف اس قدر جتنا ان کی طرف نزول ہوا ہے، اور ان ادیان میں اختلاف کو ہم اس طرح کا اختلاف قرار دیتے ہیں، جس طرح حدیث کی مختلف کتابوں میں اختلاف پایا جاتا ہے...... اس لئے ہم تمام ادیان کو جمع کرتے ہیں، اور ایک دوسرے کے ساتھ تطبیق دیتے ہیں، جس طرح مختلف احادیث میں جمع و تطبیق اختیار کی جاتی ہے" (17)

آگے ایک اور مقام پر اسی سلسلہ میں لکھتے ہیں:

> "عام فقہاء نے مسلمانوں کو اپنے اس فتویٰ سے گمراہ کیا کہ تمام کے تمام غیر مسلم باطل پر ہیں، اور ان کے پاس حق میں سے کچھ بھی نہیں" (18)

کتاب میں جناب اقبال شیدائی کے نام مولانا سندھی کے خطوط (مرتّبہ پروفیسر محمد اسلم) کے

اقتباسات بھی دیے گئے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا سندھی کا قادیانیت کے بارے میں موقف، عام موقف سے ہٹ کر اور نرم تھا۔ ان کے خطوط میں حکیم نور الدین بھیروی اور مولوی محمد علی لاہوری کے بارے میں بلند تعریفی الفاظ ملتے ہیں۔

مذکورہ بالا امور تو زیرِ تبصرہ کتاب کی اس تصویر کے حوالے سے ہیں، جو مولانا عبید اللہ سندھی کے بارے میں کتاب پڑھنے کے بعد قاری کے ذہن میں بنتی ہے، تاہم مناسب ہوگا کہ اختصار کے ساتھ یہاں مولانا سندھی کے دفاع میں پیش کی جانے والی باتوں کی ایک جھلک بھی سامنے رکھ دی جائے، تاکہ موضوع سے متعلق تصویر کے دونوں رخ سامنے آ جائیں۔ کسی شخصیت یا نظامِ فکر کے معروضی مطالعے کے لیے یہ بات ناگزیر ہے کہ اس کے دونوں پہلو سامنے رہیں۔

اس سلسلہ میں کچھ امور تو اوپر مولانا عبد الحق خان بشیر کی کتاب ''مولانا عبید اللہ سندھی اور تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی'' کے حوالہ سے آ گئے ہیں، جس کی رُو سے مولانا سندھی کے بارے میں محلِ نظر افکار کے انتساب کی اصل وجہ ان کے شاگردوں کے ''الحاقات'' اور ''حدیثِ دیگراں'' ہے، جو ''سرِ دلبراں'' کی شکل میں سامنے آ گئی ہے، اس کے ذمہ دار اصل میں مولانا سندھی نہیں ہیں۔

لیکن جیسا کہ گزشتہ سطور سے معلوم ہوا، یہ موقف زیادہ مضبوط معلوم نہیں ہوتا۔ جزوی طور پر یہ موقف درست ہے، لیکن اسے کلی طور پر قبول کرنا کافی مشکل ہے کہ مولانا سندھی کی فکر کے وہ امور جو عام علماء کے افکار سے مختلف ہیں، وہ سب دوسروں کی دسیسہ کاری ہے۔ خود مولانا سندھی کی فکر سے والہانہ وابستگی رکھنے والے علماء ان کی فکر میں شذوذ کے قائل ہیں، تاہم اس الحاق کا کلی طور پر انکار بھی ممکن نہیں، اور حق بات ان دونوں کے درمیان معلوم ہوتی ہے(19)

مولانا سندھی کے دفاع کے حوالے سے دوسرا موقف وہ ہے، جو دیوبند ہی کے سرکردہ علما میں سے مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور بعض دیگر اہلِ علم کا ہے، جنہوں نے مولانا مسعود عالم ندوی

کی تنقید کے جواب میں اپنے مجلّے برہان میں قلم سنبھالا، اور ایک سے زائد اقساط میں مولانا سندھی پر ہونے والی تنقیدوں کا جواب لکھا، جو بعد میں کتابی شکل میں ''مولانا عبید اللہ سندھی اوران کے ناقد'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس تنقید کے بارے میں مولانا اکبر آبادی کا موقف یہ تھا کہ ''اس بات کا سخت افسوس ہے کہ مولانا مسعود عالم نے مولانا سندھی پر جو تنقید کی ہے، اس میں مولانا کے افکار کو بالکل توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے۔ جس سے حقیقت کچھ سے کچھ ہوگئی ہے، اور کہیں کی بات کہیں جا پہنچی ہے''۔ (20) مختلف امور پر مولانا اکبر آبادی کا موقف پیش کرنے سے پہلے خود مولانا سندھی کی فکر کے افکار [کذا] سے اتفاق نہیں ہے اور وہ ان کی خوامخواہ طرف داری کے قائل نہیں ہیں۔ (21)

مولانا عبید اللہ سندھی کی طرف وحدتِ ادیان کی فکر کے انتساب کی وضاحت مولانا اکبر آبادی نے یہ کی ہے کہ مولانا سندھی اس معنیٰ میں وحدتِ ادیان کے قائل ہیں کہ دین اپنی اصل تعلیمات میں اشتراک رکھتے ہیں، اور قرآن نے اس بات کی صراحت کی ہے، لیکن جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ آیا موجودہ وقت میں اسلام دیگر ادیان پر برتری رکھتا ہے، اور نجات کے لیے اس کے حلقے میں داخل ہونا ضروری ہے، تو اس کی وضاحت میں مولانا اکبر آبادی، مولانا سندھی کی کتابوں کی عبارتوں سے استمداد کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''مولانا سندھی قرآن کو آخری آسمانی کتاب مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک قرآن ان تمام صداقتوں کا کامل مجموعہ ہے، جو اسلام سے پہلے مختلف ادیان میں بکھری پڑی تھیں۔ قرآن کا قانون تمام انسانوں کے لیے ہے، اور انسانیت کی بھلائی کا راز صرف اسی کے اتباع اور پیروی میں ہے۔ سرور صاحب لکھتے ہیں کہ مولانا کے نزدیک قرآن نے تمام اقوام، ادیان اور مذاہب کے مرکزی نکات کو جو کل انسانیت پر منطبق ہوسکتے ہیں، یک جا کیا اور ساری دنیا کو یہ دعوت دی کہ صرف یہی ایک اساس ہے، جس پر صحیح انسانیت کی تعمیر ہوسکتی ہے''۔ (22)

کتاب میں شامل مقالات میں اس بات پر بھی تنقید ملتی ہے کہ مولانا عبید اللہ سندھی کی فکر میں

اشتراکیت اور نیشنل ازم کا عنصر شدت سے موجود ہے اور وہ اس طرزِ فکر کے داعی تھے۔ مولانا مسعود عالم ندوی کی کتاب ''مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے افکار وخیالات پر ایک نظر'' کے مختلف اجزا اس کتاب میں شامل کیے گئے ہیں۔ تاہم انصاف کی بات یہ ہے کہ مولانا سندھی نے جہاں اس تحریک کی خوبیوں کو بنظرِ استحسان دیکھا ہے، اس کی خامیوں پر بھی مختلف مقامات پر گفتگو کی ہے۔ اس سلسلے میں مولانا سندھی کی تحریروں کی طرف رجوع کیا جائے، نیز ان کے دفاع میں لکھی جانے والی باتوں کو دیکھا جائے، تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سوشل ازم کو دو مختلف پہلوؤں سے دیکھتے ہیں۔ اس کا ایجابی پہلو یہ ہے کہ یہ تحریک بندہ مزدور کے استحصال کے خلاف آواز اٹھاتی ہے، اور موجودہ دور کی سب سے بڑی لعنت سرمایہ داری کی مخالف ہے۔ اس پہلو سے مولانا سندھی کے ہاں اس کے استحسان پر گفتگو ملتی ہے، لیکن اس تحریک کے معنوی پہلو پر مولانا سندھی کی تنقید بھی بالکل واضح ہے، اور اس سے صرفِ نظر کرنا کسی طرح بھی قرینِ انصاف نہیں ہے، یہاں ان کی تفسیر الہام الرحمان کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے:

> ''روسی انقلاب ایک اقتصادی انقلاب ہے، جس کا دین کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور نہ حیاتِ اخروی سے کوئی سروکار رکھتا ہے۔ ہم نے ان کی صحبتوں میں بیٹھ کر نہایت لطیف طریق سے امام ولی اللہ دہلوی کا وہ پروگرام انہیں بتایا جو حجۃ اللہ البالغہ میں مذکور ہے، جب انہوں نے ہم سے پوچھا کہ اس پروگرام پر کوئی قوم عمل بھی کرتی ہے، تو ہمیں اس کا جواب نفی میں دینا پڑا، تو انہوں نے کہا کہ افسوس اگر کوئی ایسی قوم ہوتی، تو ہم ان کا مذہب اختیار کر لیتے اور جو ہمارے پروگرام میں سخت مشکل پیش آتی ہے، یعنی کسانوں کا مسئلہ، وہ دور ہو جاتی۔ یہ ہے ان کی تمام باتوں کا ملخص۔ اس فکر میں ہم نے کوئی تحریف نہیں کی۔ ہم اس سے یقین کرتے ہیں کہ وہ قرآن کے پروگرام کو قبول کرنے پر مجبور ہیں، خواہ کچھ عرصہ کے بعد ہی

سہی۔ تاریخِ انسانیت میں اشتراکیت سے بڑھ کر کوئی تحریک فطرت انسانی یعنی تعلیمِ قرآنی کے مخالف پیدا نہیں ہوئی۔ جب یہ تحریک بھی ہدایت قرآنی کے قبول کرنے کی محتاج ہے، تو باقی تحریکات کا کیا پوچھنا''۔ (23)

زیرِ تبصرہ کتاب کی یہ گزارشات مولانا سندھی کے افکار کے حوالے سے تھیں، جو طویل ہوگئیں۔

کتاب کا دوسرا حصہ تنظیم فکرِ ولی اللہی کے حوالے سے ہے۔ تنظیم فکرِ ولی اللہی، خانقاہِ رائے پور کے چوتھے صدر نشین مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری نے ملتان میں 1987ء میں قائم کی جس میں کالج، یونیورسٹیوں اور مدارس کے طلبہ شامل ہیں۔ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے بورڈ نے 3 جمادی الثانیہ 1421ھ، 4 ستمبر 2000ء کو اپنی مرکزی مجلس عاملہ میں تنظیم فکرِ ولی اللہی کے طرزِ عمل اور افکار و نظریات کے پیشِ نظر، اس کو بورڈ سے خارج کرنے کا فیصلہ کیا، جس کی وجہ یہ تھی کہ وفاق کے نزدیک ''اس تنظیم کے نظریات، جمہور امت کے موقف کے منافی ہیں''۔ (24) کتاب میں شامل تنظیم کے خلاف فتاویٰ میں تنظیم کے افکار کو بھی پیش کیا گیا ہے، جن کے باعث فتاویٰ وجود میں آئے ہیں۔ جامعہ فاروقیہ کراچی کے فتوے میں درج ہے:

''یہ لوگ اپنا نظریہ اور منشور عام لٹریچروں اور مجلسوں میں بیان نہیں کرتے، بلکہ مختلف پروگراموں کے ذریعے تدریجاً اپنے کارکنوں کے ذہن میں منتقل کرتے رہتے ہیں، چنانچہ کچھ عرصہ بعد اس تنظیم سے منسلک ہونے والا آخر کار دہریت کے قریب یا بالکل دہریہ بن جاتا ہے''۔ (25)

بنوری ٹاؤن کراچی کے فتوے میں تنظیم کے محلِ نظر افکار کا نسبتاً تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے، جو حسبِ ذیل ہے:

1۔ بلا سمجھے قرآن پڑھنے کو بت پرستی جیسا سمجھنا

2۔ جنت و دوزخ کو نفسی کیفیات قرار دینا

3۔ جنت و دوزخ کے دوام کا انکار کرنا

4۔ حوضِ کوثر کو مجردات ادراک سے حاصل شدہ عقلی لذت قرار دینا

5۔ عقیدۂ شفاعت کو اخلاق کی بربادی کا باعث قرار دینا

6۔ عصرِ حاضر کی مساجد کو مسجدِ ضرار قرار دینا

7۔ حیاتِ عیسیٰ جیسے عقیدہ کو یہودی و صابی من گھڑت کہانی قرار دینا

8۔ ظہورِ مہدی اور نزولِ عیسیٰ کے عقیدہ کو غیر اسلامی کہنا

9۔ حدیث کو مستقل وحی نہ ماننا وغیرہ۔(26)

دیگر فتاویٰ میں بھی اس طرح کے امور ذکر کیے گئے ہیں۔

ان فتاویٰ کے معروضی اور عادلانہ جائزے کا تقاضا یہ ہے کہ خود تنظیم فکر ولی اللّٰہی کے لٹریچر کی طرف رجوع کیا جائے کہ وہ حضرات ان باتوں کے جواب میں کیا کہتے ہیں۔ اس بات کا جائزہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ موجودہ دور میں جس طرح افتراق و تشتت نے ہمارا اجتماعی شیرازہ بکھیرنے میں غیر معمولی کردار ادا کیا ہے، وہ ہماری جدید تاریخ کا افسوسناک باب ہے۔ بعض اوقات یک رخے فتووں کی وجہ سے کسی شخصیت یا جماعت کے بارے میں ایک ایسی تصویر تیار کر دی جاتی ہے، جو خود ان لوگوں کی تصریحات کے خلاف ہوتی ہے، جن کے خلاف فتاویٰ دیے گئے ہوتے ہیں۔

مذکورہ بالا فتاویٰ کے منظرِ عام پر آنے کے بعد تنظیم کے تین علماء مفتی عبدالمتین نعمانی، مفتی عبدالقدیر اور مفتی عبدالغنی قاسمی نے ان فتاویٰ کا جائزہ لیا، اور ایک کتاب اپریل 2006ء میں ''تنظیم فکر ولی اللّٰہی کی بابت فتووں کی حقیقت'' کے نام سے شائع کی، دیانت کا تقاضا ہے کہ ان فتاویٰ پر ان تصریحات کو پیشِ نظر رکھا جائے۔

مذکورہ بالا فتاویٰ جب سامنے آئے تو تنظیم کے بانی مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری نے مولانا

عبیدالرحمٰن اشرفی (نائب مہتمم جامعہ اشرفیہ) کے نام ایک خط لکھا جس میں کہا کہ:

''آج کل بعض شرپسند عناصر نے خود ساختہ چند غلط عقائد بنا کر میری طرف منسوب کرنے کی انتہائی مکروہ کوشش کی ہے، تاکہ خانقاہِ رائے پور کے عظیم سلسلہ اور میرے متعلق لوگوں کے ذہنوں میں شکوک وشبہات پیدا کیے جائیں۔ میں اپنے اکابر علماء دیوبند، اکابر رائے پور، اکابر مجلسِ احرار اور جمعیۃ علماء ہند کے مسلک ومشرب کا پابند وترجمان ہوں۔ میرے خیالات اپنے بزرگوں اور سرپرستوں اور اکابرین دیوبند سے ذرہ بھر مختلف نہیں ہیں۔ میں اپنے بزرگوں کی تصدیق سے چھپنے والی کتاب المهند علی المفند مؤلفہ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ میں مذکورہ عقائد کا ہی پابند ہوں۔ گمراہ کن پروپیگنڈے کے ذریعے سے پھیلائے جانے والے عقائد ونظریات سے میرا اور میرے متعلقین کا کوئی تعلق نہیں۔ ہم بزور تاکید اس کی تردید کرتے ہیں''۔(27)

اس کتاب میں مولانا سلیم اللہ خان کے نام تنظیم والوں کے خطوط بھی شامل ہیں، جن میں ان تمام عقائد سے برأت کا اظہار کیا گیا ہے، جن کی تفصیل اوپر ذکر کی گئی ہے، اور جن کی بنیاد پر تنظیم کے افراد پر گم راہ ہونے کا فتویٰ دیا گیا ہے۔ کتاب کے ص 62 پر ''الزامات کی حقیقت'' کے نام سے ایک عنوان قائم کیا گیا ہے، جس کے تحت ایک ایک کر کے ان تمام عقائد کی تردید کی گئی ہے کہ تنظیم کے افراد یہ موقف نہیں رکھتے، نیز مولانا عبیداللہ سندھی کی عبارات کو بھی ان الزامات کی تردید کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہ تفصیل ص 146 تک پھیلی ہے، اور کتاب کا اصل حصہ ہے۔ البتہ اس کتاب میں ایک کمی بہر حال نظر آتی ہے کہ فتووں میں مولانا سندھی کی جو محلِ نظر عبارات پیش کی گئی ہیں، ان کی توجیہ کے لیے کتاب عام طور پر خاموش ہے۔ لیکن بہرحال تنظیم کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کرنے سے پہلے نہایت ضروری ہے کہ ان تفصیلات کو پیشِ نظر رکھا جائے، کیونکہ کسی مسلمان کے بارے میں تفسیق یا

ضلال کا فتویٰ بے حد نازک اور اخروی نقطہ نظر سے سنگین بات ہے۔ دنیاوی پہلو سے موجودہ افتراق کی فضا میں بھی اس بات کا التزام بہت ضروری ہے، برصغیر میں ایسے متعدد واقعات ہیں کہ فتاویٰ کے اجرا میں مطلوبہ احتیاط نہیں برتی گئی، اور اس کا نتیجہ باہمی توڑ اور انتشار کی صورت میں ہم بھگت رہے ہیں۔

کسی انسان کی وہی رائے معتبر ہوتی ہے، جس کی تصریح وہ خود اپنے بارے میں پیش کرے، اس لیے ضروری ہے کہ فتاویٰ کے جواب میں اس بنیادی کتاب کو کسی صورت بھی نظر انداز نہ کیا جائے۔ زیرِ تبصرہ کتاب میں ان فتاویٰ کو تو پیش کر دیا گیا ہے، لیکن ضروری تھا کہ احقاقِ حق کے لیے خود تنظیم کے افراد کے جواب پر بھی مختصراً کچھ عرض کر دیا جاتا، تاکہ معروضی مطالعے کا ذہن رکھنے والے ایک قاری کے لیے کسی نتیجے پر پہنچنا آسان ہوتا۔ محض یک طرفہ بات کو ذکر کرنا پہلے سے طے شدہ ذہن کا نتیجہ ہوتا ہے، جو علمی اور تحقیقی نقطہ نظر سے افسوسناک ہے، اور علمی دنیا کے مسلمہ ضابطوں کے منافی۔

مولانا عبدالحق خان بشیر کی کتاب کا ذکر بھی اس تبصرے میں آیا ہے۔ جو 2004ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں بھی تنظیم کے افکار پر نقد ہے، تاہم اس کتاب کو بھی 2006ء میں شائع ہونے والے اس جواب کے تناظر میں دیکھنا چاہیے، زیرِ تبصرہ کتاب کے یک رخے مطالعے کا ایک داخلی قرینہ یہ بھی ہے کہ اس میں تنظیمِ فکرِ ولی اللّٰہی کے بارے میں علماء کی آراء نقل کرتے ہوئے مولانا عبدالحق خان بشیر کی رائے نقل کی گئی ہے، لیکن انہوں نے اپنی کتاب میں مولانا سندھی کا جو دفاع کیا ہے، اس کا اشارہ بھی کتاب میں مؤلف نے نہیں کیا۔ اپنے مطلب کی بات اخذ کرنے کی یہ افسوسناک روش ہے۔

مولانا سندھی کے افکار کے محلِ نزاع ہونے میں ایک بڑا مسئلہ ان کے طریق ابلاغ کی ژولیدگی بھی ہے۔ انہوں نے مولانا منظور نعمانی کے مجلّے الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر کے لیے ایک مضمون ''امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت کا اجمالی تعارف'' املا کروا کر بھیجا، تو اس کے آغاز

میں مولانا نعمانی نے جو نوٹ لکھا، اس کا ایک حصہ یہ ہے:

''حضرات اہل علم، خصوصاً اصحاب درس سے گزارش ہے کہ وہ اس مقالہ کو سرسری نظر سے نہیں، بلکہ غور و تعمیق کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں، نیز ہر بحث کو شروع سے آخر تک بالاستیعاب ملاحظہ فرمائیں، اور جہاں جہاں ضروری سمجھیں، ایک دفعہ سے زیادہ غور فرمائیں، میں نے خود بھی بعض مقامات کا چند چند بار اور بہت غور سے مطالعہ کیا، تو مراد کو سمجھ سکا''۔(28)

خود امام شاہ ولی اللہ دہلوی، جن کے شارح مولانا سندھی ہیں، کی عبارت کے بارے میں مولانا سید سلیمان ندوی کا تبصرہ ہے کہ ''حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی تعبیرات ایسی نازک ہیں کہ کفر و اسلام کے درمیان پل صراط کا فرق رہ جاتا ہے''۔(29)

اس تبصرے میں ممکنہ حد تک کوشش کی گئی ہے کہ یک رُخا نہ ہو اور مسلمانوں کی ایک جماعت کے بارے میں زیادہ سے زیادہ حسنِ ظن کا باعث ہو۔ اس میں مولانا سندھی کے تفردات (جن کا انکار خود ان کے عقیدت مند بھی نہیں کرتے) کا بے جا دفاع کرنے کی کوشش بھی نہیں کی گئی، اور ان کے افکار کی کلی مخالفت کے طرز کو بھی محلِ نظر سمجھا گیا ہے، اور کوشش کی گئی ہے کہ مولانا سندھی کے بارے میں تصویر کے دونوں رُخ سامنے آجائیں، تاکہ ایک قاری جب اس مطالعے کو اپنا موضوع بنائے، تو اس کے پیشِ نظر دونوں پہلو ہوں۔

مولانا سندھی کے بارے میں تنظیم فکر ولی اللہی کے افراد کے لیے بھی مناسب طرز یہی ہے کہ مولانا سندھی کے جو افکار شاذ ہیں، اور امت کے اجماعی تعامل کے منافی ہیں، ان کے بے جا دفاع کرنے سے گریز کریں۔ امت کو افتراق و تشتت سے بچانے کا یہی اسلم طریق ہے۔

مولانا سندھی کی سیاسی بصیرت، معاصر حالات اور تاریخ کی بدلتی کروٹوں کا گہرا عمرانی ادراک 'بزمِ جہاں کے اور ہی انداز' پر نظر وغیرہ وہ امور ہیں، جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا، اور ایسے مفکر کی نظر اگر فہم دین کی Textual Approach سے آگے بڑھ کر Semi

Textual یا Contexual کی حدود میں داخل ہو جائے، تو معاصر تناظر میں اس کی اہمیت پر عمرانی اور عالمی حالات کے پہلو سے غور کرنا چاہیے۔

حوالہ جات

1۔مولانا صوفی عبدالحمید سواتی، مولانا عبیداللہ سندھی کے علوم وافکار(گوجرانوالہ: ادارہ نشرواشاعت، 2007ء)، 13۔

2۔حافظ عبدالحق خان بشیر نقشبندی، مولانا عبیداللہ سندھی اور تنظیم فکرولی اللہی، مقدمہ، مولانا زاہدالراشدی (گجرات: حق چاریار اکیڈمی، 2004ء)، 22۔

3۔مولانا سندھی کی فکر میں بعد از ہجرت کا یہ زمانہ نمایاں امتیازات اور تغیرات کا زمانہ ہے، ورنہ ان کی فکر کے بعض اجزا پر دیوبند میں کافی پہلے اختلاف سامنے آ گیا تھا، چنانچہ زیر تبصرہ کتاب میں مولانا مناظر احسن گیلانی کی کتاب احاطہ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن کے اقتباسات دیے گئے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بعض افکار سے اختلاف دیوبند میں 1914ء، 1915ء کے زمانے میں نمایاں ہو چکا تھا۔(دیکھئے مفتی محمد رضوان، مولانا عبیداللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرولی اللہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ (راولپنڈی: ادارہ غفران، 2014ء)، 109 ومابعد۔)

4۔مولانا عبیداللہ انور، ''پروفیسر محمد سرور مرحوم'' مشمولہ پروفیسر محمد سرور، ''مولانا عبیداللہ سندھی: حالات، تعلیمات اور سیاسی افکار'' (لاہور: عبیداللہ سندھی فاؤنڈیشن، 2014ء)، 273-278۔

5۔نبی بخش لودھی کے مضمون ''فکرِ مولانا عبیداللہ سندھی: ایک معروضی جائزہ'' کے آغاز میں شامل تعارفی کلمات، ماہنامہ ساحل کراچی، مارچ 2007ء، ص 86۔

6۔سید ابوالاعلیٰ مودودی، ''تبصرہ بر کتاب مولانا عبیداللہ سندھی از پروفیسر محمد سرور''، ترجمان القرآن، جولائی، اگست، ستمبر 1944ء، 25:1، 2، 3، 4، 119-120۔

7۔یہاں اشارہ مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی طرف ہے، جنھوں نے مولانا سندھی کے دفاع میں ندوۃ المصنفین سے اپنے جاری کردہ مجلّے برہان میں مقالات تحریر کیے، جو بعد میں ''مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے ناقد'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔

8۔سید سلیمان ندوی، مکاتیب سید سلیمان ندوی، مرتب، مسعود عالم ندوی (لاہور: مکتبہ چراغ راہ، 1954ء)، 187۔ یہ خط 10 مئی 1945ء کا ہے، یہ وہ دور ہے جس سے کافی پہلے مولانا ندوی، مولانا اشرف علی تھانوی کے حلقہ ارادت میں آ چکے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے یہاں تنقید میں کسی موضوعیت کو رکاوٹ نہیں بننے دیا ہے۔

9۔ دیکھیے: محمد موسیٰ بھٹو، بیسویں صدی کے اسلامیت کے ممتاز شارح (حیدرآباد سندھ: سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ، 2005ء)، 179، 180 بہ حوالہ ہفت روزہ صدق، 23 جون 1945ء۔

10۔ دیکھیے: مفتی محمد رضوان، مولانا عبیداللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرولی اللہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ (راولپنڈی: ادارہ غفران، 2016ء) 489 ومابعد۔

11۔ مفتی محمد رضوان، نفس مصدر (طبع دوم)، 31۔

12۔ نفس مصدر، 35، 36۔

13۔ القرآن 2:233۔

14۔ مفتی محمد رضوان، مصدرِ سابق، 56۔

15۔ نفس مصدر، 225۔

16۔ نفس مصدر، 225۔

17۔ نفس مصدر، 238۔

18۔ نفس مصدر، 352، 353۔

19۔ چنانچہ مولانا صوفی عبدالحمید سواتی، مولانا عبیداللہ سندھی کے علوم وافکار میں یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ ''انصاف کی بات یہ ہے کہ حضرت مولانا سندھی کے بعض افکار شاذ بھی ہیں، بعض مرجوح قسم کے خیالات بھی ہیں، اور بعض باتیں ایسی ہیں کہ مولانا ان پر بے جا سختی بھی کرتے تھے، بعض باتیں مصلحت کی خاطر بھی ناگزیر خیال کرتے تھے اور بہت سی باتیں ایسی بھی ہیں، جن کی نسبت ان کی طرف کرنے میں ان کے تلامذہ نے غلطی کی ہے۔ ان کی ذمہ داری حضرت مولانا پر نہیں، بلکہ ان کے ناقلین پر ہے، جنھوں نے ان باتوں کو نقل کیا ہے، اور شاید سابق لاحق سے قطع نظر کر کے حضرت مولانا سندھی کا مطلب بھی نہیں پا سکے۔'' (سواتی، مرجع سابق، 13۔)

20۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے ناقد (لاہور: المحمود اکیڈمی)، 26۔

21۔ اکبر آبادی، نفس مصدر، 27، 28۔

22۔ نفس مصدر، 50۔

23۔ عبدالحق خان بشیر نقشبندی، مولانا عبیداللہ سندھی اور تنظیم فکر ولی اللہی (گجرات: حق چار یار اکیڈمی، 2004)، 161، 162 بہ حوالہ مولانا عبیداللہ سندھی، الہام الرحمٰن، 1:14، 15۔

24۔ مفتی محمد رضوان، مصدر سابق، 374۔

25۔ نفس مصدر، 376۔

26۔ دیکھیے: نفس مصدر، 379، 380۔

27۔ عبدالمتین نعمانی، عبدالقدیر، عبدالغنی قاسمی، تنظیم فکر ولی اللہی کی بابت فتوؤں کی حقیقت (شعبہ نشر و اشاعت تنظیم فکر ولی اللہی پاکستان، 2006ء)، 44، 45۔

28۔ الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر، جلد 7، شمارہ 9، 10، 11، 12، بابت ماہ رمضان، شوال، ذی قعدہ، ذی الحجہ، 1359ھ، 234۔

29۔ مسعود عالم ندوی (مرتب)، مکاتیب سید سلیمان ندوی (لاہور: مکتبہ چراغ راہ، 1954ء)، 179۔

(ماخوذ از: ماہنامہ ''الشریعہ'' گوجرانوالہ، ستمبر 2016ء، صفحہ 38 تا 51)

ماہنامہ ''الشریعہ'' کے تبصرے پر استدراک

(از: محمد سفیر الاسلام)

محترم مولانا عمار خان ناصر صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

ستمبر ۲۰۱۶ء کے ماہنامہ الشریعۃ میں مفتی محمد رضوان صاحب کی تالیف ''مولانا عبید اللہ سندھی کے افکار اور تنظیمِ فکرِ ولی اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ'' کے دوسرے ایڈیشن پر مولانا سیّد متین احمد شاہ صاحب کا فاضلانہ تبصرہ پڑھا۔ تبصرہ نگار ممکن حد تک غیر جانبدار رہے ہیں اور تبصرے کو کسی طور یک رخا نہیں کہا جاسکتا۔ بہرحال غالباً عجلت کے سبب چند غلطیاں تبصرے میں راہ پا گئی ہیں۔ ریکارڈ کی درستی کے لیے انہیں ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

۱۔ مولانا سندھی مرحوم کے سب سے بڑے راوی پروفیسر محمد سرور ہیں۔ کمیت کے اعتبار سے مولانا سندھی کے افکار وملفوظات کو مرتب کر کے پیش کرنے میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ پروفیسر صاحب کی مرتبہ کتابوں کی اشاعت کے بعد مولانا سندھی شدید تنقید کا نشانہ بنے اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ محترم متین شاہ صاحب نے پروفیسر محمد سرور کی کتاب ''افادات وملفوظاتِ حضرت مولانا عبید اللہ سندھی'' کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ کتاب مولانا کی زندگی میں شائع ہوئی تھی ۔ یہ ایک تسامح ہے۔ یہ کتاب مولانا کے انتقال کے بعد ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی ۔ یاد رہے کہ مولانا سندھی کا انتقال ۲۲ اگست ۱۹۴۴ء کو ہوا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اگر یہ کتاب مولانا کی زندگی میں شائع ہوئی ہوتی تو انہیں شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا۔ مولانا کی زندگی میں شائع ہونے والی پروفیسر محمد سرور کی کتاب ''مولانا عبید اللہ سندھی: حالاتِ زندگی، تعلیمات اور سیاسی افکار'' ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی اور مولانا نے اسے own کیا۔ (ملاحظہ ہو پروفیسر محمد سرور کی وفات پر مولانا

عبید اللہ انور کا تعزیتی مضمون جو ہفت روزہ خدام الدین میں شائع ہوا۔ یہ مضمون محولہ بالا کتاب کے حالیہ ایڈیشن میں بھی شامل ہے)

۲۔ فاضل مبصر لکھتے ہیں:

''مولانا عبدالحق خان بشیر نے اپنی کتاب ''مولانا عبید اللہ سندھی اور تنظیم فکر ولی اللّٰہی'' میں پروفیسر محمد سرور کا نام مولانا سندھی کے ناقابل اعتماد تلامذہ کی فہرست میں شامل نہیں کیا، حالاں کہ مولانا سندھی کے افکار پر جو تنقید ہوئی ہے وہ زیادہ تر ان تحریروں کی روشنی میں ہوئی ہے، جو پروفیسر صاحب کی مرتب کی ہوئی ہیں''۔

غالباً شاہ صاحب کی نظروں سے مولانا عبدالحق خان بشیر کی کتاب کی درج ذیل سطور اوجھل ہوگئیں:

''فکری اعتبار سے مولانا سندھی کے تلامذہ کو دو ٹیموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلی ٹیم حضرت [احمد علی] لاہوریؒ اور حضرت خواجہ عبدالحی فاروقیؒ پر مشتمل ہے۔ دوسری ٹیم میں علامہ موسیٰ جار اللہ، مولانا عبداللہ لغاری، پروفیسر محمد سرور اور شیخ بشیر احمد لدھیانوی شامل ہیں۔ ان میں سے حضرت سندھی کے افکار کی حقیقی ترجمان تو صرف پہلی ٹیم ہے۔ اس کے برعکس دوسری ٹیم سے تفسیرِ قرآن کے سلسلے میں بیشتر مقامات پر سنگین نوعیت کی خطرناک نظریاتی اغلاط کا صدور ہوا ہے۔۔۔اس [ٹیم] میں پروفیسر محمد سرور کے پیش کردہ سیاسی و معاشی افکار میں متعدد کمزوریاں موجود ہیں اور ان کی بعض عبارات حضرت سندھی کے بارے میں بے شمار شکوک کو جنم دیتی ہیں'' (ص۷۹، ۸۰)

مولانا عبدالحق خان بشیر اس کتاب کے صفحہ نمبر ۹۵ میں لکھتے ہیں:

''۔۔۔۔باقی رہی بات پروفیسر محمد سرور مرحوم کی تو حضرت سندھی کی نسبت سے پیش کردہ ان کے بعض افکار، ناقابل قبول اور قابل گرفت ہیں۔

چنانچہ مولانا صوفی عبدالحمید سواتی تحریر فرماتے ہیں:۔

پروفیسر محمد سرور نے ایک مجموعہ ''مولانا عبیداللہ سندھی: حالاتِ زندگی، تعلیمات اور سیاسی افکار'' مرتب کیا ہے۔ اور دوسرا مجموعہ ''افادات وملفوظاتِ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ'' ہے۔ یہ دونوں مجموعات بڑے اہم ہیں اور دونوں قابلِ تنقید ہیں ۔ان مجموعات میں مولانا سندھی کے بارے میں صحیح، قابل وثوق، ضعیف، موضوع، غیر قابل اعتماد ہر قسم کی باتیں موجود ہیں''۔(مولانا عبیداللہ سندھی کے علوم وافکار، ص ۱۰۷)

حیرت ہے کہ مولانا سندھی کے بارے میں مولانا صوفی عبدالحمید سواتی کو پروفیسر محمد سرور کی کتاب ''مولانا عبیداللہ سندھی: حالاتِ زندگی، تعلیمات اور سیاسی افکار'' میں قابلِ تنقید باتیں اور موضوع روایتیں نظر آ گئیں، لیکن خود مولانا سندھی کو نظر نہیں آئیں اور انہوں نے اس کتاب کو own کر لیا۔

۳۔ محترم متین شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے پروفیسر محمد سرور کی کتاب ''مولانا عبیداللہ سندھی: حالاتِ زندگی، تعلیمات اور سیاسی افکار'' پر اپنے تبصرے میں مولانا سندھی کی فکر کے قابل تنقید امور کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

''مولانا [سندھی] مرحوم کی یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ ان کا تعلق علمائے کرام کے اس طبقے سے تھا جو اپنی گروہی عصبیت میں حدِ کمال پر پہنچا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا یہ سب کچھ فرما گئے اور لکھوا اور چھپوا بھی گئے اور پھر بھی تنقید کی زبانیں بند اور تعریف کی زبانیں تر رہیں۔ ورنہ اگر انہوں نے اس طبقۂ خاص سے باہر جگہ پائی ہوتی تو ان کا استقبال سرسید اور علامہ مشرقی سے کچھ کم شاندار نہ ہوا ہوتا''۔

(ترجمان القرآن، جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۴۴ء)

محترم شاہ صاحب کا کہنا ہے کہ مفتی محمد رضوان صاحب کی زیرِ نظر کتاب مولانا مودودی کی اس

بات کی تردید کرتی ہے کیونکہ اس میں شامل تقریباً تمام مقالات علمائے دیوبند کے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ محترم شاہ صاحب نے یہ بات عجلت اور رواروی میں لکھی ہے۔ مفتی رضوان صاحب نے اپنی کتاب میں شامل تقریباً تمام مضامین کی تاریخِ اشاعت دے دی ہے۔ مولانا مودودی نے محولہ بالا تبصرہ ستمبر ۱۹۴۴ء کے ترجمان القرآن میں لکھا، جب کہ علمائے دیوبند کے مضامین اس کے بعد شائع ہوئے۔ اس میں بہرحال ایک استثنا مولانا ظفر احمد عثمانی کا مضمون ''طلوعِ اسلام'' مولانا سندھی اور شاہ ولی اللہ ہے۔ یہ مضمون ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا۔ فاضل مبصر نوٹ فرمائیں کہ مولانا سندھی کے بارے میں دیوبندی مکتبِ فکر کے زعیم مولانا حسین احمد مدنی کا مضمون اخبارِ مدینہ بجنور کی ۱۷ مارچ ۱۹۴۵ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ اسی طرح مولانا مناظر احسن گیلانی کا مضمون ''فکرِ سندھی'' کسی دینی یا علمی مجلّے میں نہیں، بلکہ مسلم لیگ کے ترجمان روزنامہ منشور دہلی میں ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا۔ وہاں سے lift کر کے اسے ہفت روزہ صدق لکھنو کی ۱۳ جون تا ۱۴ جولائی، ۱۹۴۵ء کی اشاعتوں میں شائع کیا گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ مضمون مولانا سندھی کی زندگی میں ۱۹۴۳ء میں لکھا گیا تھا اور اکابر علما کی توثیق کے حصول کے پیشِ نظر اسے فوری طور پر شائع نہیں کیا گیا۔ یہ بات بھی ۲۰۱۱ء میں شائع ہونے والی کتاب ''مجموعہ خطوطِ گیلانی'' مرتبہ محمد راشد شیخ کے ذریعے سامنے آئی۔

مولانا سندھی کے حوالے سے اُن کی زندگی میں شائع ہونے والی سب سے زیادہ اختلافی کتاب پروفیسر محمد سرور کی ''مولانا عبیداللہ سندھی: حالاتِ زندگی، تعلیمات اور سیاسی افکار'' ہے۔ میں شاہ صاحب سے بصد احترام دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ مولانا کی زندگی میں کس ممتاز دیوبندی عالم نے اس کتاب پر نقد و تبصرہ لکھا؟ دیوبندی اکابر کی اسی خاموشی پر مولانا مناظر احسن گیلانی نے مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام درد اور کرب سے بھرا ہوا ایک خط لکھا جو ۲۳ جون ۱۹۴۵ء کی صدق کی اشاعت میں شائع ہوا۔ یہ خط مفتی رضوان

صاحب کی کتاب میں شامل ہے۔ اس کے برعکس دارالعلوم دیوبند کے ایک فاضل کی زیر ادارت شائع ہونے والے ماہنامہ برہان دہلی نے مولانا سندھی کی بھرپور تائید کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا عبدالماجد دریابادی کے ہفت روزہ صدق میں ۱۹۳۹ء ہی سے مولانا سندھی کے افکار کی تردید شروع ہوگئی تھی، لیکن مجھے اس پر تحفظات ہیں کہ مولانا اشرف علی تھانوی سے بیعت ہوجانے کی بنیاد پر مولانا عبدالماجد دریابادی کا شمار علمائے دیوبند میں کیا جاسکتا ہے۔

اگر اس عریضے میں کوئی بات محترم متین شاہ صاحب کے لئے گرانیِ طبع کا باعث ہو تو آپ کی وساطت سے ان سے پیشگی معذرت۔

محمد سفیر الاسلام

ای میل: safeerjanjua@gmail.com

(ماہنامہ ''الشریعۃ'' گوجرانوالہ، نومبر 2016، صفحہ نمبر ۴۹ تا ۵۱)

مولانا سندھی کے افکار اور تنظیمِ فکرِ ولی اللّٰہی کے نظریات......

کے بارے میں ایک خط

محترم جناب مولانا مفتی محمد رضوان صاحب۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

آپ کی تالیفِ لطیف ''مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیمِ فکرِ ولیُ اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ'' کے مطالعہ کا شرف حاصل ہوا، جس سے الحمدللہ بہت فائدہ ہوا۔

جناب سے دو باتیں عرض کرنا ہیں۔ایک تو یہ کہ ابھی حال ہی میں ماہنامہ ''الشریعہ'' گوجرانوالہ، ستمبر 2016ء میں آپ کی مذکورہ تالیف پر مولانا متین احمد شاہ صاحب کا تبصرہ ملاحظہ کیا، جس کے بعد نومبر 2016ء کے ماہنامہ ''الشریعہ'' میں مولانا متین احمد شاہ صاحب کے تبصرے پر جناب محمد سفیر الاسلام صاحب کا ایک استدراک بھی شائع ہوا۔ان دونوں تحریروں کی عکسی نقول برائے ملاحظہ ارسال ہیں۔مولانا متین احمد صاحب کی طرف سے تحریر کیے گئے تبصرہ میں جناب کی تالیف پر کچھ تحفظات وشبہات ذکر کیے گئے ہیں، ان کے بارے میں جناب کی رائے معلوم کرنی تھی۔

دوسری عرض یہ ہے کہ مذکورہ تبصرہ میں جناب سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے ایک مضمون کے اقتباس کا بھی ذکر ہے، مجھے اگرچہ مولانا مودودی صاحب سے خاص عقیدت نہیں، لیکن بہرحال وہ ایک صاحبِ قلم آدمی تھے۔انہوں نے مولانا سندھی یا ان کی کسی کتاب کے بارے میں کیا لکھا ہے؟ جس کا اقتباس تبصرہ میں درج کیا گیا ہے، اگر یہ مکمل مضمون دستیاب ہو، تو اس کی نشاندہی کر دی جائے، اور مزید کسی صاحبِ قلم نے اس موضوع پر کچھ لکھا ہو، جو آپ کی کتاب میں شامل نہ ہو، تو اس سے بھی آگاہ کر دیا جائے۔امید ہے کہ ناگواری نہیں فرمائیں گے۔ والسلام عبدالرحمٰن، پیرودھائی، راولپنڈی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خط کا جواب

(از: مفتی محمد رضوان)

بندہ محمد رضوان نے مذکورہ خط کا جو جواب تحریر کیا، وہ تفصیلی ہونے کی وجہ سے ایک مضمون کی شکل اختیار کرگیا ہے، جس کو ذیل میں نقل کیا جارہا ہے۔

مکرمی! وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

آپ کے مکتوب میں ''الشریعۃ'' کے جس تبصرہ اور اس پر استدراک کا ذکر ہے، وہ ہماری نظر سے گزرا۔ اس سلسلہ میں ہم نے متعلقہ مآخذ کی طرف مراجعت کی اور تبصرے کا بنظرِ غائر جائزہ لیا، جس کے نتیجے میں یہ مفصل مضمون تیار ہوگیا۔ اسے ان شاء اللہ تعالیٰ ہماری کتاب کے آئندہ ایڈیشن میں بھی تیسرے ضمیمہ کے طور پر شامل کیا جائے گا۔

جہاں تک آپ کی طرف سے خط میں ذکر کردہ دو باتوں کا تعلق ہے، تو ان کے جوابات تفصیل طلب ہیں، ان کے قدرے تفصیلی جوابات اگلے صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

محمد رضوان

(1)

ماہنامہ ''الشریعہ'' کے تبصرے پر گفتگو

(از: مفتی محمد رضوان)

مرسلہ مکتوب میں ذکر کردہ پہلی بات کے متعلق عرض ہے کہ فاضل مبصر مولانا متین احمد شاہ صاحب کے بندہ کی تالیف پر تفصیل کے ساتھ تبصرہ فرمانے پر بندہ ان کا ممنون ہے۔

اس کے بعد عرض ہے کہ کتاب کے مؤلف کا تبصرہ نگار کے تمام خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں، جس طرح مبصر کا کسی کتاب کے تمام مضامین سے اتفاق ضروری نہیں۔

ہر مسلمان اور بالخصوص صاحبِ علم عنداللہ اسی رائے کا مکلّف ہے، جس کو وہ اپنے اور اللہ کے درمیان دلائل وحقائق کی رُو سے حق و سچ سمجھتا ہو۔

فاضل مبصر کے تبصرے کے سلسلے میں بندہ کی طرف سے چند معروضات پیش کی جاتی ہیں۔

فاضل مبصر کے تبصرہ میں ابہام

(1)...... فاضل مبصر نے اپنے تبصرہ میں حتی الامکان یک رُخانہ ہونے کی ممکنہ کوشش فرمائی ہے، جس کے بارے میں آخر میں انہوں نے خود تحریر کیا ہے کہ:

> اس تبصرے میں ممکنہ حد تک کوشش کی گئی ہے کہ یک رُخانہ ہو اور مسلمانوں کی ایک جماعت کے بارے میں زیادہ سے زیادہ حسنِ ظن کا باعث ہو۔ اس میں مولانا سندھی کے تفردات (جن کا انکار خود ان کے عقیدت مند بھی نہیں کرتے) کا بے جا دفاع کرنے کی کوشش بھی نہیں کی گئی، اور ان کے افکار کی کلی مخالفت کے طرز کو بھی

محلِ نظر سمجھا گیا ہے، اور کوشش کی گئی ہے کہ مولانا سندھی کے بارے میں تصویر کے دونوں رُخ سامنے آ جائیں، تاکہ ایک قاری جب اس مطالعے کو اپنا موضوع بنائے، تو اس کے پیشِ نظر دونوں پہلو ہوں (ماہنامہ ''الشریعۃ'' گوجرانوالہ، ستمبر 2016، صفحہ نمبر ۴۹)

''یک رُخا'' نہ رہنے کے اصول پر عمل پیرا ہونے کی اس کوشش کے باوجود فاضل مبصر نے یہ واضح نہیں کیا کہ وہ مسلمانوں کی کس جماعت کے بارے میں زیادہ سے زیادہ حسنِ ظن کے خواہش مند ہیں، اور نہ ہی حسنِ ظن کی کوئی تعریف وتحدید فرمائی، تاکہ معلوم ہوتا کہ اگر دلائل وحقائق کسی جماعت یا فرد سے حسنِ ظن کے متقاضی نہ ہوں، تو بھی غلط کو صحیح قرار دے کر حسنِ ظن رکھنے اور اس پر عوام کے گمراہی مرتب ہونے والے ثمرات ونتائج کو نظر انداز کرنے کا کیا درجہ ہے؟ اور اگر متعینہ حقائق کو یکسر نظر انداز کر کے حسنِ ظن قائم کرنے کی بھی شریعت میں کوئی حیثیت ہے، تو پھر یہ حسنِ ظن کیا کسی مخصوص جماعت کے ساتھ ہوگا یا اس کا حکم تمام جماعتوں اور افراد پر منطبق ہوگا، خواہ وہ حق سے کتنے ہی منحرف کیوں نہ ہوں؟

فاضل مبصر کے بیان کردہ تین نقطہ ہائے نظر پر گفتگو

(2)...... فاضل مبصر نے اپنے تبصرہ میں مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے متعلق تین قسم کی آراء یا تین قسم کے نقطہ ہائے نظر یا تین قسم کے مواقف کا ذکر کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

> ایک نقطۂ نظر کی رُو سے مولانا عبیداللہ سندھی کی فکر جمہور علمائے امت کی فکر سے جدا ہے (اور یہی حکم تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کا ہے)۔ زیرِ تبصرہ کتاب کے مؤلف کا نقطۂ نظر یہی ہے، اور اسی کی تائید کرنے والی تحریرات کو اس میں جمع کیا گیا ہے۔ یہ نقطۂ نظر ان کی اپنی زندگی میں لکھی گئی یا دیگر مرتبین کی مرتب کردہ کتابوں کی روشنی میں بنتا ہے۔

دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مولانا (سندھی) کی فکر میں اگرچہ شاذ امور بھی پائے جاتے ہیں، تاہم بحیثیتِ مجموعی وہ کتاب وسنت کی ہی ترجمان ہے۔ اس نقطۂ نظر کے حاملین کے نزدیک مولانا سندھی کی طرف بعض افکار اور تحریریں غلط طور پر بھی منسوب ہیں، جن کی ذمہ داری ان پر نہیں آتی، بلکہ ان کے تلامذہ اس کے ذمہ دار ہیں، تاہم ان حضرات کے نزدیک تنظیم فکر ولی اللّٰہی کے افکار درست نہیں۔ اس رجحان کے قائل مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا صوفی عبدالحمید سواتی، مولانا زاہد الراشدی اور مولانا عبدالحق خان بشیر وغیرہم ہیں (ماہنامہ ''الشریعۃ'' گوجرانوالہ، ستمبر 2016، صفحہ نمبر 39)

اس کے بعد کچھ آگے چل کر فاضل مبصر فرماتے ہیں کہ:

تیسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مولانا سندھی کی جملہ تحریرات وافکار ان کی اپنی ہی ہیں، اور کوئی چیز ان کی طرف غلط منسوب نہیں ہے۔ یہ نقطۂ نظر ان کے جملہ افکار کا مؤید اور داعی ہے۔ یہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری اور تنظیم فکر ولی اللّٰہی کا رجحان ہے، اور ان حضرات نے علماء کی طرف سے دیئے گئے فتووں کا جواب اور اپنے نظریات کی وضاحت بھی کی ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب میں جیسا کہ ذکر ہوا، پہلے نقطۂ نظر کے حوالے سے تحریرات جمع کی گئی ہیں (ماہنامہ ''الشریعۃ'' گوجرانوالہ، ستمبر 2016، صفحہ نمبر 41)

مذکورہ تقسیم فاضل مبصر نے قائم کی ہے، جس سے کسی دوسرے اور خود اِن نقطہ ہائے نظر کو منسوب کیے گئے افراد کا اتفاق کرنا ضروری نہیں، تاہم اگر فاضل مبصر یہ سمجھتے ہیں کہ بندہ کی تالیف میں پہلے قسم کے نقطۂ نظر کی آراء کو جمع کیا گیا ہے، تو اس موقع پر مناسب تھا کہ جس طرح انہوں نے دوسرے اور تیسرے نقطۂ نظر کے حاملین کے اسمائے گرامی کو ان کے نقطہ ہائے نظر کے ساتھ ساتھ ذکر کیا ہے، پہلے نقطۂ نظر کے حاملین کے اسمائے گرامی کا بھی اس

نقطۂ نظر کے ساتھ ہی ذکر کردیا جاتا، اور اس نقطۂ نظر کو صرف بندہ کی طرف منسوب کرنے پر اکتفاء نہ کیا جاتا، کیونکہ بندہ تو ان تحریرات کا صرف ناقل وجامع ہے۔ اس طرح عام قارئین کو دوسرے دونوں نقطہ ہائے نظر کی طرح یہ فرق کرنے میں بھی آسانی رہتی کہ پہلے اور باقی نقطہ ہائے نظر کے حاملین کون کون ہیں، اور ان کا علمی مقام اور علمائے دیو بند کی فکر میں درجہ کیا ہے؟

فاضل مبصر کی تقسیم کے مطابق اگر دوسرے نقطۂ نظر کے حاملین میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا صوفی عبدالحمید سواتی، مولانا زاہد الراشدی اور مولانا عبدالحق خان بشیر وغیرہم شامل ہیں، اور تیسرے نقطۂ نظر کے حاملین میں ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری صاحب اور تنظیم فکرولی اللّٰہی کے حضرات شامل ہیں تو ان ہی کی تقسیم کے مطابق پہلے نقطۂ نظر کے حاملین میں مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، مولانا حسین احمد صاحب مدنی، مولانا احمد علی صاحب لاہوری، مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی، مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی، مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی، مولانا سید سلیمان صاحب ندوی، مولانا مسعود عالم صاحب ندوی، مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی، مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی، مولانا مفتی عبدالواحد صاحب، اور بعض دیگر اہلِ علم شامل ہیں (ماہنامہ ’’الشریعۃ‘‘ گوجرانوالہ، ستمبر 2016، صفحہ نمبر 38)

اس کے بعد مذکورہ نقطہ ہائے نظر اور ان کے حاملین کے اسمائے گرامی کا ذکر کرکے فاضل مبصر کو یہ بھی واضح کرنا مناسب تھا کہ کس رائے کے حاملین کا علمی وفقہی درجہ کیا ہے، اور ان میں کس کی رائے میں زیادہ وزن نظر آتا ہے؟

پھر بندہ نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ مولانا سندھی کی طرف منسوب تمام باتیں درست اور حقیقت پر مبنی ہیں، خواہ وہ ’’تنظیم فکرولی اللّٰہی‘‘ کے افراد کی طرف سے بیان کردہ ہوں، تو فاضل مبصر کا یہ فرمانا کیا معنیٰ رکھتا ہے کہ:

''یہی حکم تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کا بھی ہے''

بقول فاضل مبصر تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی ،مولانا سعید احمد رائے پوری صاحب نے 1987ء میں قائم کی۔ظاہر ہے کہ جس وقت مولانا سندھی کے متنازع بیانات اوران پر اہلِ علم کی تنقیدات سامنے آئیں،اس وقت تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کا وجود بھی نہیں تھا۔اور نہ ہی مولانا سندھی کے اُن براہِ راست تلامذہ کا جنھوں نے مولانا سندھی کی تقریرات وتحریرات قلم بند کیں،موجودہ ''تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی'' سے کوئی تعلق تھا۔

اور نہ ہی بندہ نے مولانا سندھی کے بارے میں یہ حکم لگانے کی کوشش کی ہے کہ ان کے کتنے افکار جمہور اہلُ السنۃ والجماعۃ کے مطابق ہیں،اور کتنے متصادِم ہیں،اور کتنے اور کس قسم کے اور کن اسباب وعوامل کی بنیاد پر شاذ افکار کی وجہ سے کوئی شخص اہلُ السنۃ والجماعۃ یا اہلِ اسلام میں داخل یا خارج ہوتا ہے؟ اہلِ علم حضرات کا خود مولانا سندھی کی اپنی اوران کے متعلق نقل کردہ تحریرات اوران کے عوامل واسباب کی روشنی میں کوئی نتیجہ اخذ کرنا ،اگلا مرحلہ اور ایک مستقل کام ہے،جس میں ذوق وغیرہ کے مختلف ہونے سے نتیجہ کے مختلف برآمد ہونے کا بھی امکان ہے۔

اوراگر فاضل مبصر کے نزدیک یہی حکم تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کا بھی ہو،تو علمائے دیوبند کے جن اکابر واہلِ افتاء کے فتاویٰ اور فیصلے تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کے متعلق نقل کیے گئے ہیں،وہ بھی پہلے موقف کے حاملین کے ساتھ شامل ہوں گے۔

فاضل مبصر کے ذکر کردہ دوسرے نقطۂ نظر پر تبصرہ

(3)...... فاضل مبصر اپنے تبصرہ میں دوسرے نقطۂ نظر کے حاملین پر قدرے نقد وجرح کرنے کے بعد ان کے بارے میں فرماتے ہیں:

اس سلسلہ میں کچھ امور تو مولانا عبدالحق خان بشیر کی کتاب ''مولانا عبیداللہ سندھی

اور تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی'' کے حوالہ سے آ گئے ہیں، جس کی رُو سے مولانا سندھی کے بارے میں محلِ نظر افکار کے انتساب کی اصل وجہ ان کے شاگردوں کے ''الحاقات'' اور ''حدیثِ دیگراں'' ہے، جو '' سرِ دلبراں'' کی شکل میں سامنے آ گئی ہے، اس کے ذمہ دار اصل میں مولانا سندھی نہیں ہیں۔

لیکن جیسا کہ گزشتہ سطور سے معلوم ہوا یہ موقف زیادہ مضبوط معلوم نہیں ہوتا، جزوی طور پر یہ موقف درست ہے، لیکن اسے کلی طور پر قبول کرنا کافی مشکل ہے کہ مولانا سندھی کی فکر کے وہ امور جو عام علماء کے افکار سے مختلف ہیں، وہ سب دوسروں کی دسیسہ کاری ہے۔ خود مولانا سندھی کی فکر سے والہانہ وابستگی رکھنے والے علماء ان کی فکر میں شذوذ کے قائل ہیں، تاہم اس الحاق کا کلی طور پر انکار بھی ممکن نہیں، اور حق بات ان دونوں کے درمیان معلوم ہوتی ہے (ماہنامہ ''الشریعۃ'' گوجرانوالہ، ستمبر 2016، صفحہ نمبر 45)

اس کے بعد آگے چل کر فاضل مبصر نے مولانا سندھی کے بعض شاذ افکار کو امت کے اجتماعی تعامل کے خلاف قرار دیا ہے، جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

اولاً تو سوال یہ ہے کہ مولانا سندھی کے وہ شاذ افکار کون کون سے ہیں کہ جو امت کے اجتماعی تعامل کے منافی ہیں؟ کیونکہ اصل مسئلہ تو یہی بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے کا ہے، وہ کون باندھے؟ اگر مسلکِ دیوبند سے وابستہ مستند اہلِ علم و اکابر حضرات کی طرف سے مولانا سندھی کے بیان کردہ شاذ افکار کی نشاندہی کی تفصیل منظور نہیں، تو پھر ان کے بعد اس کی تعیین کون کرے گا، اور مذکورہ مشاہیر اہلِ علم و اکابر کے بعد اس کی تعیین کو کیا مقام و درجہ حاصل ہوگا؟

اس موقع پر مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب زید مجدہٗ کی طرف سے اٹھائے گئے درجِ ذیل سوال کا جواب بھی فاضل مبصر پر عائد ہوتا ہے کہ:

''مولانا کے افکار کی جو قسمیں بیان فرمائی (گئی) ہیں، ان کی علمی طور پر وضاحت بھی فرمائی جاتی کہ کون سے افکار شاذ ہیں؟ ان میں شذوذ کس درجے کا ہے؟ کون سی باتیں ان کی طرف غلط منسوب کی گئی ہیں؟ اور دلائل سے یہ بھی واضح کیا جاتا کہ ان کی اصل حقیقت کیا ہے؟

جس شخصیت کے بارے میں یہ بات مسلّم ہو کہ اس کے کچھ افکار شاذ ہیں، اس کے دفاع میں صرف اس کی صحیح باتوں کو نقل کرنا مفید نہیں ہوتا، بلکہ ان افکارِ شاذّہ کی حقیقت واضح کرنی ضروری ہوتی ہے''۔

مفتی صاحب موصوف کا یہ مضمون ہماری کتاب کے صفحہ 279و280 میں شاملِ اشاعت ہے۔

ثانیاً اگر فاضل مبصر کو دوسرا موقف زیادہ مضبوط معلوم نہیں ہوتا، اور ان کو حق بات ان دونوں کے درمیان معلوم ہوتی ہے، تو پھر فاضل مبصر کو یہ واضح کرنا ضروری تھا کہ وہ حق بات جو اِن دونوں کے درمیان ان کو معلوم ہوتی ہے، وہ کون سی ہے؟ آیا وہ فاضل مبصر کے بیان کردہ تین نقطہ ہائے نظر میں سے کسی ایک کے مطابق ہے یا کسی چوتھے نقطۂ نظر کی حامل ہے؟ فاضل مبصر کی مبہم بات سے تو اصل مسئلہ واضح نہیں ہوا، مزید پیچیدہ اور مبہم ہو گیا ہے۔

جہاں تک مولانا سندھی کے محلِ نظر افکار کے انتساب کی اصل وجہ ان کے شاگردوں کے الحاقات ہیں، تو اس پر کلام آگے آتا ہے۔

افکارِ مولانا سندھی کے متعلق ایک نقطۂ نظر پر گفتگو

(4)...... فاضل مبصر کو ہم سے درجِ ذیل شکایت ہے کہ:

تنظیمِ فکرِ ولی اللّٰہی کے بارے میں علماء کی آراء نقل کرتے ہوئے مولانا عبدالحق خان بشیر کی رائے نقل کی گئی ہے، لیکن انہوں نے اپنی کتاب میں مولانا سندھی کا

جو دفاع کیا ہے، اس کا اشارہ بھی کتاب میں مؤلف نے نہیں کیا۔ اپنے مطلب کی بات اخذ کرنے کی یہ افسوسناک روش ہے۔

(ماہنامہ ''الشریعۃ'' گوجرانوالہ، ستمبر 2016، صفحہ نمبر 48)

فاضل مبصر کو اگر دوسرے کے اس طرزِ عمل میں افسوسناک روش نظر آتی ہے، تو کسی کو خود فاضل مبصر کے طرزِ عمل میں بھی یہ روِش نظر آ سکتی ہے کہ انہوں نے مولانا عبدالحق خان بشیر صاحب کی مذکورہ کتاب کا اپنے تبصرہ میں ذکر کیا، اس کے اقتباسات نقل کیے، اس کے مقصد کو بیان کیا، لیکن اس کتاب میں تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کے بارے میں جو با حوالہ گمراہ کن افکار ونظریات ذکر کیے گئے ہیں، اس کی تفصیل بیان نہیں کی، بلکہ اس کی طرف اشارہ تک بھی نہیں کیا۔ اس کے برعکس انہوں نے مذکورہ تنظیم کے چند افراد کی طرف سے پیش کردہ مبہم ردِ عمل اور جواب کو تبصرہ کا حصہ بنانے پر اکتفاء کیا۔ جبکہ ہم نے مولانا حافظ عبدالحق خان بشیر صاحب کی رائے کتاب کے دوسرے حصہ میں نقل کی ہے، جس کا عنوان ہے ''تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کے متعلق آراء وفتاویٰ'' اور ہم نے اس میں کسی خیانت سے کام نہیں لیا۔ جیسا کہ فاضل مبصر نے خود کہا ہے کہ:

کتاب کا دوسرا حصہ تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کے حوالے سے ہے''

مولانا سندھی کے متنازع افکار کے متعلق یہ کہنا کہ یہ ان کے تلامذہ کے الحاقات ہیں، تو اس موقف سے کسی دوسرے کا اتفاق ضروری نہیں۔

ہم نے پہلے اس نکتہ پر کلام کرنے کی ضرورت اس لیے نہیں سمجھی تھی کہ جب مولانا سندھی کے معاصرین اور متعدد اکابر اور معتبر و مستند اہلِ علم وثقہ حضرات تسلسل کے ساتھ مولانا سندھی کی ہندوستان سے ہجرت کے بعد کے متعدد افکار کو شاذ قرار دے رہے ہیں، اور یہ ایک مسلمہ امر ہے، جس کی توجیہ حضرت مدنی رحمہ اللہ نے اختلال وغیرہ کے ساتھ کی ہے، تو معاملہ صاف ہو جاتا ہے۔

لیکن چونکہ فاضل مبصر نے اس نکتے کو اپنے تبصرے میں چھیڑ دیا ہے، جس کی وجہ سے یہ مسئلہ بعض لوگوں کے لیے مزید پیچیدہ اور اس کی وجہ سے حل طلب ہوگیا ہے، اس لیے اس پر اب کلام کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ مولانا حافظ عبدالحق خان بشیر صاحب زید مجدہٗ ، اپنی کتاب ’’مولانا عبیداللہ سندھی اور تنظیمِ فکرولی اللّٰہی‘‘ میں تحریر فرماتے ہیں:

فکری اعتبار سے حضرت سندھی کے مذکورہ تلامذہ کو دو ٹیموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، اوران میں سے ہرٹیم کی کارکردگی جداجدا ہے۔

پہلی ٹیم !...... شیخ التفسیر حضرت لاہوری اور حضرت مولانا خواجہ عبدالحی فاروقی پر مشتمل ہے۔

دوسری ٹیم !...... میں علامہ موسیٰ جار اللہ ، مولانا عبداللہ لغاری، پروفیسر محمد سرور مرحوم اور شیخ بشیراحمد لدھیانوی مرحوم شامل ہیں۔

ان میں سے حضرت سندھی کے افکار کی حقیقی ترجمان تو صرف پہلی ٹیم ہے، جس میں ہر قسم کی فکری ونظریاتی وحدت بھی موجود ہے، اور اسے حضرت سندھی کے رفقاء ومعاصرین اور جملہ تلامذہ کا اعتماد بھی حاصل ہے۔

اس کے برعکس دوسری ٹیم سے تفسیرِ قرآن کے سلسلہ میں بیشتر مقامات پر سنگین نوعیت کی خطرناک نظریاتی اغلاط کا صدور ہوا ہے، اور ان کے افکار ونظریات میں خوفناک نوعیت کا تضاد وتصادم بھی پایا جاتا ہے، جس کی وجہ سے وہ حضرت سندھی کے جملہ تلامذہ کے اعتماد سے محروم ہے، اور اس پر اہلِ علم کی طرف سے شدید گرفت کی گئی ہے، اس میں پروفیسر محمد سرور مرحوم کے پیش کردہ سیاسی ومعاشی افکار میں متعدد کمزوریاں موجود ہیں، اور ان کی بعض عبارات حضرت سندھی کے بارے میں بے شمار شکوک کو جنم دیتی ہیں، جبکہ شیخ بشیراحمد لدھیانوی مرحوم کے پیش

کردہ افکار میں کافی حد تک احتیاط واعتدال پایا جاتا ہے۔

اور پھر حضرت سندھی کے تمام تلامذہ میں سب سے زیادہ قابلِ اعتماد شخصیت شیخ التفسیر حضرت لاہوری کی ہے، جو واقعتاً حضرت سندھی کے حقیقی جانشین تھے، جنہوں نے بچپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپے تک حضرت سندھی کی صحبت وتربیت میں رہ کران سے علمی وفکری فیض پایا۔یہی وجہ ہے کہ سفرِ کابل کے موقع پر حضرت سندھی نے اپنی جگہ حضرت لاہوری کو ہی اپنا جانشین مقرر کیا تھا (مولانا عبیداللہ سندھی اور تنظیم فکر ولی اللّٰہی ،ص۷۹،۸۰، مؤلفہ مولانا حافظ عبدالحق خان بشیر، فصل دوم، مطبوعہ: حق چاریار اکیڈمی، مدرسہ حیاتُ النبی، گجرات، طبع اول: محرم 1425ھ، مارچ 2004ء)

مولانا زاہدالراشدی صاحب زیدمجدہٗ نے مولانا سندھی کے علوم وافکاراور تعلیمات کے صحیح ترجمانوں میں مولانا احمد علی لاہوری کے ساتھ مولانا سعید احمد اکبرآبادی کو بھی شمار کیا ہے (ملاحظہ ہو: کتابِ مذکور، ص۱۰)

بندہ صاحبِ علم بزرگ ہونے کی حیثیت سے مذکورہ حضرات کی دل سے قدر کرتا ہے،لیکن اسی کے ساتھ علمی امور میں جورائے عنداللہ حق وراجح معلوم ہوتی ہو،اس کا اختیار کرنا،اپنی ذمہ داری بھی سمجھتا ہے۔اور یہ معاملہ چونکہ کسی کی ذات کا نہیں، بلکہ دین اور علمی دیانت کا ہے، اس لیے بندہ اس سلسلہ میں اپنی رائے ظاہر کرنا ضروری خیال کرتا ہے۔

جس کی تفصیل درجِ ذیل ہے۔

مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے تلامذہ اوران کی طرف منسوب آراء کا عنداللہ کیا مقام ودرجہ یا حقیقت ہے؟اس سے قطع نظر کرتے ہوئے بندہ دلائل اورظاہری حالات وقرائن کی بنیاد پر یہ سمجھتا ہے کہ مولانا سندھی صاحب کی جو باتیں معتبر روایات سے پہنچی ہوں، ان کا بلاوجہ انکار نہ کیا جائے،اوران کے کسی شاگرد کوان باتوں کا اصل ذمہ دار قرار نہ دیا جائے، کسی دوسرے کو بلادلیل متہم نہ کیا جائے،اور ظاہری عبارات میں جو باتیں خلافِ شریعت معلوم

ہوں، ان کی تردید کی جائے، اور مولانا کی طرف سے اس قسم کی لغزشوں کو کم از کم درجہ میں ان کے ذہنی اختلال واختلاط پر محمول کیا جائے، جیسا کہ حضرت مدنی قدس سرہٗ فرما چکے ہیں۔ یہ حسنِ ظن کا کم از کم درجہ ہے، جس کی بے شمار نظیریں محدثین واصحابِ علم میں پائی جاتی ہیں، اور اہلِ علم حضرات میں معروف ومشہور ہیں۔

جبکہ بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ مسمریزم وغیرہ کے اثر سے مولانا سندھی کے افکار میں تبدیلی پیدا ہوئی، اور بعض حضرات مثلاً پروفیسر سرور صاحب سوویت یونین اور ترکی کے انقلاب اور ماحول سے متاثر ہو کر مولانا سندھی کے افکار میں تبدیلی پیدا ہونے کے مدعی ہیں۔

" وکل حزب بما لدیھم فرحون "

اور تاریخی حقائق سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ابتداء میں تو مولانا سندھی کے چند مخصوص تفردات کی وجہ سے اکابر دیوبند کی طرف سے ان کی دیوبند مدرسہ سے علیٰحدگی عمل میں آئی تھی۔ پھر ہندوستان سے باہر طویل زمانہ میں اور واپس آ کر جب مولانا سندھی کی طرف سے متعدد صریح غلط افکار سامنے آئے، تو اکابر واہلِ علم حضرات کی طرف سے ان کی تغلیط اور ان سے اپنی اور اپنے مسلکِ حقہ کی برأت کا اظہار کیا گیا۔

مولانا سندھی کی طرف منسوب متعدد شاذ افکار معتبر ومستند طریقہ پر ثابت ہیں، بالخصوص ان کے ہندوستان سے باہر طویل زمانہ کے افکار۔ ہم اپنی کتاب میں متعدد مستند ومعتبر حضرات کے ایسے مشاہدات ذکر کر چکے ہیں کہ وہ مکہ مکرمہ میں مولانا سندھی سے ملاقات اور ان کے افکار کی سماعت کے بعد ان سے بدظن ومتنفر ہو کر لوٹتے تھے، اور جن حق پرست اور معتدل حضرات نے ہندوستان واپسی کے بعد ان کی تقریرات وتحریرات ملاحظہ کیں، ان کا حال بھی یہی تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک مشاہداتی وتاریخی حقیقت ہے، جس کا کسی صورت انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ذیل میں اپنی کتاب میں مذکور صرف چند اقتباسات نقل کرنے پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ نے فرمایا:

’’مولانا (سندھی) مصائب جھیلتے ہوئے جب حجاز میں پہنچتے ہیں، اور ہم کو ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے، تو ان کی حالت دیکھ کر ہمارے تعجب اور تحیر کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ہم نے دیکھا کہ مولانا کی وہ ذہانت اور رزانت، وہ حلم اور بردباری، وہ سکون اور سکوت، جس کو ہم پہلے مشاہدہ کرتے تھے، سب کے سب تقریباً رخصت ہو چکے ہیں، ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو جاتے ہیں، چیخنے چلانے لگتے ہیں، غصہ آ جاتا ہے۔ باتیں بہت زیادہ کرنے لگے ہیں۔ بسا اوقات ایک ہی مجلس میں متضاد اور متخالف اُمور فرماتے رہتے ہیں، الخ‘‘ (مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرِ ولیُ اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ، ص ۹۷)

اور مولانا ظہور احمد بگوی صاحب نے فرمایا:

’’1936ء میں بمقام مکہ مکرمہ اُن کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا تھا۔ اُس وقت بھی میں نے یہی رائے قائم کی تھی کہ مولانا کا دماغ حوادثِ دہر کا مقابلہ نہیں کر سکا اور اس میں اختلالِ عظیم واقع ہو چکا ہے، الخ‘‘ (ایضاً، صفحہ ۴۹۵)

اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب نے فرمایا:

’’جو کچھ آپ نے مولانا عبیدُ اللہ مرحوم کے سلسلہ میں لکھا ہے، میرے نزدیک یہ مسئلہ بے حد قابلِ توجہ اور اہم ہے، نہ صرف یہ ہی بلکہ جماعتِ دیوبند میں اب بہت سی شاخیں ایسی نکل رہی ہیں جو آزادی کی مسموم ہوا سے کم و بیش متاثر ہیں، شاید کچھ مدت کے بعد ہمارے اکابر کا مسلک ایسا ملتبس (یعنی خلط ملط) ہو جائے کہ کوشش کرنے والوں کے نزدیک بھی منقح (یعنی صاف) نہ ہو سکے، الخ‘‘ (ایضاً، صفحہ ۱۰۹)

اور حضرت مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے فرمایا:

’’(مولانا سندھی) کے قیامِ حجاز کے زمانے میں جو لوگ ہندوستان سے حجاز کو

جاتے رہے، اوران سے ملتے رہے، وہ ان کے اجنبی اور بیگانہ خیالات کوسن کر جس عقیدت سے ان کی مجلس میں جاتے تھے، اس عقیدت کے ساتھ واپس نہیں آتے تھے۔ان کی ہندوستان واپسی کا سیاسی و مذہبی دونوں گروہوں کو انتظار تھا، لیکن افسوس جب وہ واپس آئے تو نہ تو وہ پہلے گروہ میں مقبول ہوئے ، اور نہ دوسرے گروہ میں'' (ایضاً،صفحہ۲۲۵)

نیز فرمایا:

''یہ معاملہ اگر ذات کا ہوتا تو یہ تحریر یہیں ختم ہوجاتی ،مگرافسوس کہ یہ ذات کا نہیں بلکہ دین کا ہے، پھرگو وہ خوداس دنیائے دَنی سے رخصت ہوگئے ،مگراپنے خیالات کواپنے دوستوں کی تحریروں کے ذریعہ سے خلعتِ دوام بخش گئے ہیں، اس لئے جب تک وہ موجود ہیں، وہ زیرِ بحث آتے ہی رہیں گے'' (ایضاً،صفحہ۲۱۹)

مزید فرمایا:

''ممکن تھا کہ مولانا کی وفات پران کے خیالات کی بھی وفات ہوجاتی ،مگرافسوس پرافسوس یہ ہے کہ ان کے افکار وخیالات کی ترتیب وتہذیب واشاعت کا فرض ایک خاص ادارہ (سندھ ساگر اکیڈمی) کی طرف سے سرانجام پایا ہے، جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ان خیالات نے اپنے بانی کی زندگی کے بعد بھی اپنی زندگی کا سامان کرلیا ہے۔ملک میں یہ خیالات برملا ظاہر کئے گئے ، اوران کی دعوت پر دعوت دی گئی، بلکہ اس کی ترتیب واشاعت میں بعض علماء نے بھی حصہ لیا'' (ایضاً، صفحہ۲۲۹)

اور ہفت روزہ ''صدق'' کے ایک ذمہ دار مبصر نے فرمایا:

''جس وقت میں ان سے مکہ معظّمہ میں حاضر ہوکر ملا، اور وہاں کئی ماہ کے قیام میں بیشتر مواقع ملاقات ومجالست کے پیش آئے ، اوران کے نئے نئے خیالات وآراء

سے واقف ہوا، تو میں نے اور میرے ساتھ دوسرے رفقاء نے بھی یہ فیصلہ کیا کہ مولانا سندھی نے اپنی طویل جلاوطنی اور غیر جنس صحبتوں کے ناخوشگوار اثرات کے ماتحت، دارُالعلوم دیوبند کی زندگی کے بہتر وخوشگوار اثرات کو ایک ایک کر کے فنا کردیا ہے۔ اور وہ روس وترکی کی لادینی تحریک نیز یورپ کی مادی ترقیات اور عقلیت پرستی سے اس قدر مسحور ہو چکے ہیں کہ اب وہ اسلام کی نئ تعبیر کرنے پر مجبور ہیں جو روس کی اشتراکیت، ترکی کی لادینیت اور یورپ کی مادہ پرستی کے ساتھ گھل مل سکے، چنانچہ مولانا آخر عمر تک اسی کی سعی میں رہے کہ اس درمیانی خلیج کو کسی نہ کسی طرح پاٹ دیا جائے، الخ'' (ایضاً، صفحہ ۲۶۷)

اور مولانا منظور نعمانی صاحب نے فرمایا:

''1937ء میں جب انڈیا ایکٹ 1935ء کے تحت ملک کے تمام صوبوں میں قومی حکومتیں قائم ہوئیں، تو (مولانا سندھی کو) ہندوستان آنے کی اجازت ملی، اور وہ غالباً 1939ء میں تشریف لائے۔ آتے ہی انہوں نے چند بیانات اخبارات میں دیئے، جو ہم جیسوں کو ہضم نہیں ہو سکے، اور ہم لوگوں نے محسوس کیا کہ مولانا بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ اسی زمانہ میں جمعیت علمائے ہند (بنگال) کی کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے جو خطبہ انہوں نے دیا، اور اس میں جو رہنمائی کی، خود جمعیۃ العلماء نے اس کے قبول کرنے سے اپنے کو مجبور سمجھا، اور جہاں تک مجھے یاد ہے اس کے بعد جمعیت کے کسی اجلاس میں مولانا نے صدارت نہیں فرمائی۔ ممدوح کی ان باتوں کی وجہ سے ان کی وہ علمی ودینی عظمت دل سے بالکل نکل گئی، جو بیسیوں برس سے قائم تھی، بلکہ ایک طرح کا بُعد اور توحش سا پیدا ہو گیا، اور یہ حال تنہا میرا نہیں تھا، جہاں تک یاد ہے ہمارے عام دینی حلقے کا یہی حال تھا، الخ'' (ایضاً، صفحہ ۴۹۲)

اور مولانا عبدالصمد رحمانی صاحب نے فرمایا:

''مولانا عبیداللہ سندھی کی تعلیمات اور افکارِ سیاسی اور ان کے سوانح حیات پر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے پروفیسر محمد سرور صاحب نے جو کتاب ''مولانا عبیداللہ سندھی'' نامی شائع کی ہے، اس کے مطالعہ کا شرف حاصل ہوا۔ مولانا سندھی کی طرف قرآن وحدیث کے جن افکار کا انتساب کیا گیا ہے، وہ اتنے غلط اور غیر اسلامی ہیں کہ ان کے متعلق اپنے قدیم حُسنِ ظن کی بناء پر ذہن یہ قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے کہ یہ واقعی مولانا کے افکار ہو سکتے ہیں۔

میرے لئے یہ سہل تھا کہ ان افکار کے متعلق مولانا سندھی سے نجی طور پر استصواب کر لیتا، مگر اس کتاب کی اشاعت کا معاملہ نجی حد سے آگے بڑھ چکا ہے، اور مولانا سندھی کے انتساب کے ساتھ یہ افکار عوام تک پہنچ چکے ہیں، اب ضرورت اس کی ہے کہ عوام کو مولانا سندھی کی زبان وقلم سے اس کی تصویب اور تغلیط معلوم ہو جائے، الخ'' (ایضاً، صفحہ ۲۶۹)

ملحوظ رہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی کی تعلیمات الخ نامی کتاب مولانا سندھی کی زندگی میں شائع ہوئی، اورانہوں نے نہ صرف یہ کہ مذکورہ افکار کی تردید نہیں فرمائی، بلکہ مذکورہ کتاب کی تصدیق بھی فرمائی۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب نے فرمایا:

''جب مولانا سندھی طویل مدت کے بعد ہندوستان تشریف لائے اور انہوں نے بعض ایسے خیالات وافکار کا اظہار فرمایا جو مولانا (احمد علی لاہوری) کے نزدیک صحیح الخیال علماء اور راسخُ العقیدہ جماعت کے عقائد وافکار ومسلک سے مطابقت نہیں رکھتے تھے...... اوران سے مسلمانوں میں ذہنی انتشار پیدا ہونے کا اندیشہ تھا، تو مولانا (احمد علی لاہوری رحمہ اللہ) نے ان کے خیالات میں متابعت نہیں فرمائی،

بلکہ صاف اپنے اختلاف کا اظہار کردیا، الخ'' (ایضاً، صفحہ ۱۰۳)

نیز فرمایا:

''مولانا سندھی مرحوم ہندوستان واپس آئے تو ان مرحوم نے بعض ایسے خیالات اور افکار کا اظہار کرنا شروع کیا جن میں توازن کی بڑی کمی تھی، اور جو بڑی غلط فہمیوں اور مغالطوں کا باعث ہوسکتے تھے۔ ان کے کسی مضمون میں قرآن وحدیث وفقہ سے متعلق بعض ایسے نظریات و''تحقیقات'' تھے، جو جمہور اہل اسلام کے عقیدہ سے مختلف تھے، یا ان کی تعبیر میں کوتاہی تھی، مولانا [مناظر احسن گیلانی] نے مدرسی وجماعتی عصبیت سے بالکل بے نیاز وبالاتر ہوکر اس مقالہ کی تردید میں ایک پرزور مقالہ لکھا، الخ'' (ایضاً، صفحہ ۱۱۲)

مزید فرمایا:

''[مولانا عبیداللہ سندھی] نے سیاسی ومعاشرتی اور ثقافتی واسلامی نظام میں عجیب وغریب اور شاذ افکار ونظریات کا اظہار کیا جن سے خود ان کے اکثر ساتھی اور مسلمانوں کے رہنما اور قائدین اتفاق نہ کرسکے، جس کی بناء پر ان کے اور علماء اور قائدین کے درمیان خلا وسیع ہوگیا......

ان کے ان نظریات وخیالات سے دینی حلقوں میں تشویش واضطراب کی لہر دوڑ گئی'' (ایضاً، صفحہ ۲۷۶)

اور مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے فرمایا:

''آخری دور میں انہوں نے پھر بعض ایسے نظریات کی تبلیغ شروع کردی جو جمہور علمائے امت کے خلاف، بلکہ نہایت خطرناک اور زائغانہ تھے، الخ'' (ایضاً، صفحہ ۲۷۵)

اور مولانا ابن الحسن عباسی صاحب نے فرمایا:

''دورۂ روس کے بعد جب ان [مولانا سندھی] کی بہارِ عمر رخصت ہوچکی تھی، ان

سے بعض ایسے نظریات وتحقیقات، ایسے افکار وخیالات کا ظہور ہونا شروع ہوا، جو ان کی سابقہ تاریخ سے میل نہیں رکھتے تھے۔ یہ شدتِ جذبات کی لرزش کا بھی نتیجہ ہو سکتے ہیں، اور طویل ومسلسل صعوبتوں کا اثر بھی کہلا سکتے ہیں۔ بات یہاں تک ہوتی تو خیر کوئی حرج نہیں، اسے ان کی ذات کا معاملہ سمجھ کر چھوڑ دینا چاہیے، لیکن کچھ لوگ مولانا کے اس دور کے انہی افکار ونظریات کو لے کر میدان میں اترے ہیں (اور) منظّم انداز میں ان افکار کی اشاعت وتبلیغ میں مصروف ہیں'' (ایضاً، صفحہ۳۳۶)

مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے تلمیذِ خاص، پروفیسر محمد سرور صاحب کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ مولانا سندھی کے آخری دور کے افکار سے ان کے ہم مسلک تمام کے تمام علما نے اختلاف کیا، اور مولانا سندھی کے آخری دور کے افکار میں سیاحتِ روس وغیرہ کا دخل تھا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

اس میں شک نہیں کہ مولانا سندھی جب واپس وطن آئے، تو ان کے ہم مسلک تمام کے تمام علماء نے ان کے افکار سے اختلاف کیا، اور ان کا پوری طرح شخصی احترام کرتے ہوئے جو کہ دیوبند کے مکتب فکر کا خصوصی امتیاز ہے، ان کے بارے میں بعض حضرات نے یہاں تک کہا کہ تمام عمر تکلیفیں اور اذیتیں اٹھا اٹھا کر ان کا دماغ چل گیا ہے۔ اس میں البتہ صرف ایک ذات مستثنیٰ ہے، اور وہ ہے مولانا سعید احمد اکبرآبادی صاحب کی۔ انہوں نے مولانا سندھی کے پیام کو سمجھا، اس کی نشر واشاعت کی اور مولانا کا زبردست دفاع کیا۔ ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ کے نہایت جارحانہ تبصرہ کا مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے بڑا مفصل جواب دیا، جو بعد میں کتابی شکل میں چھپ گیا ہے (افادات وملفوظات، صفحہ۹۶، بعنوان ''علمی وفکری مراکز، سیاسی اجتماعات میں شرکت''، مطبوعہ: سندھ ساگر اکادمی، لاہور، تاریخِ اشاعت: 2014ء)

وہ مزید لکھتے ہیں:

مولانا سندھی پورے تیرہ سال مکہ معظّمہ میں پڑھتے پڑھاتے، سوچتے، لکھتے اور لکھواتے رہے۔ اس عرصے میں ان کی اپنے اہلِ وطن اور دنیائے اسلام سے آنے والے اہلِ علم وفکر سے بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ راقم السطور کے نزدیک جب وہ 1939ء میں ہندوستان پہنچے، اور آخر میں جب وہ اپنے رب کے ہاں سدھارے، توان درمیانی سالوں میں انہوں نے جو کچھ فرمایا، اور لکھا، یہ حاصل تھا ان اثرات کا، جنہیں سیاحتِ روس نے ایک نیا موڑ دیا تھا، اور جن کوانہوں نے مکہ کے قیام کے دوران میں ایک نظریاتی اور فکری ترتیب دی تھی (ایضاً، صفحہ ۱۹۸، ۱۹۹، بعنوان ''سوشلزم اور مذہب'')

جناب ماہر القادری صاحب کی یہ عبارت آگے آتی ہے:

''اسی زمانے میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اعلان فرمایا تھا کہ دیوبند مولانا عبیداللہ سندھی کے افکار کا ذمہ دار نہیں ہے''

مگر مذکورہ اور اس قسم کے دیگر تمام مشاہدات اور تاریخی حقائق کو نظرانداز کر کے ایک طبقہ مولانا سندھی کے آخری دور کے شاذ افکار کو تاویلات کر کے درست قرار دینے پر مُصر ہے۔

جبکہ ایک طبقہ کا حال یہ ہے کہ وہ مولانا سندھی کے اس دور کے مذکورہ مشاہدات کو تو قبول کرتا ہے، لیکن مولانا سندھی کے اس دور کی اُن تحریرات اور امالی یا ان میں مذکور شاذ افکار کو قبول نہیں کرتا، جو مولانا سندھی کی زبان سے نکلنے کے بعد قلمبند کر لیے گئے۔

پھر آخر وہ کون سے شاذ افکار تھے، جن کو براہِ راست سن کر اہلِ علم اور متدیّن حضرات مولانا سندھی کی مخالفت کرتے تھے، اور ان نظریات وخیالات سے دینی حلقوں میں تشویش واضطراب کی لہر دوڑ گئی تھی؟

اس کے بعد عرض ہے کہ مولانا سندھی کے بعض تلامذہ مثلاً مولانا احمد علی لاہوری اور مولانا

عبدالحی فاروقی وغیرہ کی تحریروں میں اس طرح کے شاذ افکار نہ ہونے سے جو مولانا سندھی کی کتب وتحریرات اور مضامین میں منقول ہیں، یہ لازم نہیں آتا کہ مولانا سندھی کے آخری دور میں بھی مولانا سندھی کے مذکورہ بالا تلامذہ والے افکار ہی رہے ہوں، بلکہ خود مولانا لاہوری وغیرہ کی تصریح کے مطابق مولانا سندھی کے ہندوستان سے باہر چلے جانے کے بعد اِن افکار میں تبدیلی آ گئی تھی، جس سے خود مولانا لاہوری وغیرہ نے برأت کا اعلان کر دیا تھا۔ جس سے معلوم ہوا کہ مولانا سندھی کے شاذ افکار کو ان کے بعض مستند تلامذہ نے قبول نہیں کیا، بلکہ رَد کیا، پس یہ حضرات مولانا کے نہ تو شاذ افکار کے ترجمان قرار دیئے جاسکتے ہیں، اور نہ ہی خود ان حضرات کے وہ شاذ افکار تھے، جن کا اظہار مولانا سندھی نے اپنے آخری دور میں کیا۔

مولانا احمد علی لاہوری صاحب کا ذکر

جہاں تک مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ کے مولانا سندھی کے سب سے معتمد تلمیذ اور اس کے نتیجہ میں اُن کو مولانا سندھی کا صحیح ترجمان قرار دینے کا تعلق ہے۔

تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ اولاً تو وہ مولانا سندھی کے ابتدائی دور کے شاگرد ہیں۔

ثانیاً وہ مولانا سندھی کے ہندوستان سے بیرون ممالک چلے جانے کے بعد کے اِن مذہبی وسیاسی خیالات سے اپنے بری ہونے کا اعلان فرما چکے ہیں، جو قرآن وسنت کے منافی ہیں۔

چنانچہ مولانا لاہوری رحمہ اللہ کا مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ کے نام درجِ ذیل مکتوب ہم اپنی کتاب میں شامل کر چکے ہیں:

> ’’مولانا سندھی مرحوم کے قبل از ہجرت جو خیالات تھے، جن کی بنیاد خالص کتاب وسنت پر تھی، اور مسلکِ اسلاف سے نکلنا جرمِ عظیم سمجھتے تھے، میں فقط انہیں خیالات سے متاثر اور مستفید ہوں۔ بعد از ہجرت جو اُن کے خیالات میں مذہباً یا سیاستاً تبدیلی آ گئی تھی، میں اس سے ہرگز متفق نہیں ہوا، حالانکہ وہ مجھے اپنا ہم

خیال بنانے میں مصر تھے، اسی لئے وہ مجھ سے آخر دم تک ناراض رہے، اور اسی مخالفت کے باعث بہت کچھ برا بھلا کہا کرتے تھے'' (مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرِ ولیُ اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ، صفحہ ۱۰۲)

جب مولانا سندھی کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد کے قرآن وسنت کے منافی شاذ افکار سے، ان کے سب سے زیادہ معتمد تلمیذ مولانا احمد علی لاہوری بھی اختلاف فرما چکے ہیں، اور ان میں سیاسی ومذہبی تبدیلی آنے کا اعتراف فرما چکے ہیں، پھر آگے کلام کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے؟

اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ مولانا سندھی کے آخری دور کے افکارِ شاذہ کے ترجمان نہیں بنے، بلکہ مولانا لاہوری نے مولانا سندھی کے ان افکارِ شاذہ کی وجہ سے اُن سے علیٰحدگی کا اعلان فرما دیا اور اس کے نتیجہ میں خود مولانا سندھی نے بھی انہیں اپنے ساتھ رشتہ انسلاک سے آزاد کر دیا (ملاحظہ ہو: مکاتیب مولانا عبیداللہ سندھی ص ۳۹، مطبوعہ: مولانا عبیداللہ سندھی اکیڈمی، کراچی، پاکستان، اشاعتِ اول ۱۹۹۷ء)

اور جہاں تک مولانا سعید احمد اکبرآبادی کا تعلق ہے، تو وہ بھی مولانا سندھی کے تمام افکار سے متفق نہیں، جس کا اعتراف انہوں نے اپنی تحریر میں کیا ہے، اور اس کا ذکر فاضل مبصر نے بھی کیا ہے۔ البتہ اسی کے ساتھ وہ مولانا سندھی کے بعض افکار میں تاویلات کے قائل ہیں، مگر ان کا یہ طرزِ عمل جمہور اہلِ علم واکابرِ دیوبند سے مختلف ہے، جس سے دوسروں کا اتفاق ضروری نہیں۔ اسی وجہ سے پروفیسر محمد سرور صاحب نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے کہ مولانا سندھی کے ہم مسلک تمام کے تمام علماء نے ان سے اختلاف کیا، البتہ صرف مولانا سعید احمد اکبرآبادی صاحب کی ذات اس سے مستثنیٰ ہے، جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔

پروفیسر محمد سرور صاحب کا ذکر

رہا پروفیسر محمد سرور صاحب کی مرتب کردہ بعض تحریرات اور ان کے مولانا سندھی کے معتمد تلمیذ

ہونے یا نہ ہونے کا معاملہ، تو یہ خود مولانا سندھی، اور حضرت مولانا احمد علی لاہوری صاحب کے فرزند مولانا عبید اللہ انور صاحب، جو مولانا سندھی کے براہِ راست شاگرد بھی ہیں، اور دیگر اصحابِ علم طے کر چکے ہیں۔ پروفیسر صاحب کی مولانا سندھی کے حوالے سے بعض تالیفات خود مولانا سندھی کی حیات میں طبع ہوئیں، اور مولانا نے ان کی توثیق فرمائی، جن میں سے بعض چیزوں کا ذکر فاضل مبصر نے اور محمد سفیر الاسلام صاحب نے اپنی تحریرات میں کیا ہے، اور ہماری تالیف میں بھی ان کے بارے میں تفصیل شائع ہو چکی ہے۔

حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ کے فرزند مولانا عبید اللہ انور صاحب کے پروفیسر سرور صاحب اور ان کی تالیفات کے بارے میں درجِ ذیل الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

[پروفیسر] سرور صاحب کی خوش نصیبی تھی کہ وہ مکہ معظّمہ میں بھی مولانا [سندھی] سے مستفیض ہوئے، اور مراجعتِ وطن کے بعد یہاں بھی پانچ برس تک مولانا سے شاہ ولی اللہ کی کتابیں تحقیق و محنت سے پڑھتے رہے، اور ان کے افکار و خیالات کے استفادہ میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی، اس دوران میں بھی امام ولی اللہ اور مولانا سندھی پر برابر لکھتے رہے۔ بعد میں شاہ صاحب کی کتابوں کے انہوں نے نہایت عمدہ تراجم کیے اور خود سرور صاحب کی تصنیف ''ارمغان شاہ ولی اللہ'' اپنے موضوع پر بے نظیر کتاب ہے، جسے شاہ ولی اللہ کی کتابوں کا خلاصہ اور نچوڑ کہنا چاہیے، اور علومِ قرآنی کے طلبہ کے لیے تو وہ ایک نعمت ہے۔ ایسے ہی مولانا سندھی پر ''افادات و ملفوظات'' اور ''مولانا عبید اللہ سندھی'' نام کی دو کتابیں لکھ کر تو انہوں نے امت پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ انہی دنوں ''نوائے وقت'' کے مشہور کالم نویس میاں محمد شفیع صاحب نے صحیح لکھا کہ سرور صاحب نے مولانا کے خیالات کو آج کے قومی اور عالمی حالات کے پسِ منظر میں شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔ اگر یہ کتاب انگریزی میں لکھی جاتی، تو آج سارے عالمِ اسلام میں اس کی دھوم

مچ گئی ہوتی۔ 1943ء میں جب یہ کتاب چھپی، تو ذاکر (حسین) صاحب (وائس چانسلر، جامعہ ملیہ، دہلی) نے اسے پڑھ کر فرمایا ''سرسید کی لائف ''حیاتِ جاوید'' میں نے کئی بار پڑھی ہے، لیکن یہ کتاب پڑھنے کے بعد اب وہ مجھے ایک مرثیہ محسوس ہوتی ہے۔ اِس کتاب میں روشنی، پیغام، امید اور زندگی کی امنگ دکھائی دیتی ہے۔'' اس کا منظرِ عام پر آنا تھا کہ پورے ہندوستان میں ایک تہلکہ مچ گیا۔

جماعت اسلامی نے تو آسمان سر پر اٹھالیا۔ میرے سامنے ملک نصراللہ خان عزیز نے مولانا سندھی سے پوچھا اس کتاب کے بارے میں خود آپ کی کیا رائے ہے؟ مولانا نے فرمایا ''پروفیسر صاحب نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ میرے افکار وخیالات سے متصادم کوئی چیز اس میں نہ آنے پائے، ظاہر ہے خیالات تو میرے ہی ہیں، لیکن زبان وبیان سرور صاحب کا ہے'' (افادات وملفوظات، امام عبیداللہ سندھی، صفحہ ۴۲۱، ۴۲۲، بعنوان ''پروفیسر محمد سرور مرحوم، از قلم: مولانا عبیداللہ انور'' بحوالہ: ہفت روزہ ''خدام الدین'' لاہور، 14 نومبر 1983ء، مطبوعہ: سندھ ساگر اکادمی، لاہور، تاریخِ اشاعت: 2014ء)

مولانا عبیداللہ انور صاحب مزید لکھتے ہیں:

سرور صاحب جیسے ذہین وفطین، انسان دوست آفاق گیر اور علم ودانش کے رسیا روز روز نہیں پیدا ہوتے۔ ان کا بزمِ علم وادب سے اٹھ جانا کوئی معمولی بات نہیں۔ ان کے علم وفکر کے ڈانڈے بلند پایہ مفکرینِ اسلام سے جا ملتے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں دورِ خلافتِ راشدہ، بنو امیہ، بنو عباس، تاریخِ اسلام عہد بہ عہد، ترقی وتنزل نیز برعظیم میں مسلم دور کی داستان اور مفکرینِ عالمِ اسلامی کے افکار ونظریات پر انہیں بھرپور گرفت حاصل تھی، اور اپنی کتابوں میں انہوں نے اس پر بے لاگ تبصرے بھی کیے ہیں، جس کے اثرات دور رَس ہوں گے۔ میرے نزدیک وہ اسلام کی

متاع بے بہا تھے، طلباء علومِ اسلامی اور عام شائقینِ علم وفن اور خاص طور پر جویانِ حق وصداقت ضرور اس سے استفادہ کریں گے (ایضاً، صفحہ ۴۲۴)

سرور صاحب فطرت کا ایک عطیہ تھے، جن کی دریافت مولانا سندھی ہیں، اور مولانا سندھی نے ہمارے لیے شاہ ولی اللہ کو دریافت کیا (ایضاً، صفحہ ۴۲۴، و "امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی، حیات وخدمات" از: ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری، صفحہ ۴۲۲، باب چہارم)

غور طلب امر یہ ہے کہ بعض اہلِ علم کے بقول مولانا عبید اللہ سندھی صاحب خود بھی اور ان کے سب سے معتمد شاگرد مولانا احمد علی لاہوری کے فرزند جو مولانا سندھی کے براہِ راست شاگرد بھی ہیں تو پروفیسر سرور صاحب کو مولانا سندھی کا صحیح اور معتبر ترجمان قرار دے رہے ہوں، اور کوئی دوسرا شخص پروفیسر صاحب کی ترجمانی کو غیر معتبر قرار دے، تو اس کی کیا حیثیت ہوگی؟

اس کے علاوہ ممتاز محقق ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری صاحب نے پروفیسر سرور صاحب اور مولانا سندھی کے روابط کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

سرور صاحب جنوری 1939ء میں مولانا سندھی مرحوم کی خدمت میں پہنچے، تو مولانا کی انقلابی شخصیت اور ملک کی آزادی کے لیے ان کی خدمات سے پوری طرح باخبر تھے، اور اردو، انگریزی، عربی زبانوں سے واقفیت اور مختلف سیاسی جماعتوں اور افراد کی خدمات سے آگاہی بھی حاصل تھی۔ غرض کہ علم ومطالعہ اور فکر ونظر کی دولتوں سے آراستہ ہوکر، مگر طالب علمانہ جذبے کے تحت پہنچے تھے، لیکن ان کے علم ومطالعہ اور فکر ونظر کی حیثیت مولانا سندھی مرحوم جیسی شخصیت کے سامنے کیا تھی، جو گزشتہ 23، 24 برس سے ملک سے دور تھی، جن کا نہ ملک کی سیاسیات سے براہِ راست تعلق تھا، نہ معلومات کے ان کے پاس آج کل جیسے بہترین ذرائع تھے ("امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی، حیات وخدمات، صفحہ ۳۸۸، باب چہارم،

بعنوان ’’مولانا سندھی اور ان کے نیاز مند‘‘ مطبوعہ: دارالکتاب، اردو بازار، لاہور، اشاعتِ دوم: مئی 2016ء)

ہندوستان واپس آنے کے بعد بھی مولانا سندھی مرحوم سے (سرور صاحب کے) استفادہ کا سلسلہ جاری رہا۔ معمول یہ تھا کہ سرور صاحب کو جب کبھی مولانا کی خدمت میں بار ملتا، مولانا مذہب، سیاست، تاریخ، تصوف وغیرہ کا کوئی موضوع انتخاب فرمالیتے، اوراس پر گفتگو شروع کردیتے۔ سرور صاحب چپ چاپ بیٹھے سنتے رہتے، کبھی کوئی بات واضح نہ ہوتی، یا ان کی سمجھ میں نہ آتی، تو وہ مولانا سے پوچھ لیتے۔ مولانا نہایت شرح وبسط سے اس کا جواب دیتے، اور ایک ایک نقطے کی پوری وضاحت فرماتے، بعض دفعہ یہ صحبت تمام تمام دن جاری رہتی، بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ مولانا نمازِ صبح کے بعد جو بیٹھے، تو سارا دن تعلیم وارشاد فرماتے گزار دیا، مجلس ختم ہوتی، تو سرور صاحب مکان پر پہنچ کر مولانا کے ان ارشادات کو اپنی یادداشت سے قلمبند کرلیتے (ایضاً، صفحہ ۳۹۰)

یہ بات سرور صاحب نے مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم پر اپنی کتاب کے پیشِ لفظ میں لکھی ہے۔ یہ کتاب مولانا کے ’’حالاتِ زندگی، تعلیمات اور سیاسی افکار‘‘ میں ہے، اور مولانا سندھی مرحوم کی زندگی ہی میں اکتوبر 1943ء میں شائع ہوئی تھی۔ مولانا مرحوم نے اسے پسند فرمایا تھا، چونکہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد سرور صاحب کے بارے میں مولانا سندھی مرحوم کی رائے بہت اچھی ہوگئی، اور انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ ان میں نہ صرف ان کی باتوں کو سمجھنے کی استعداد ہے، بلکہ وہ ان کی ترتیب اور پیش کش کا سلیقہ بھی رکھتے ہیں۔

اس کے بعد مولانا سندھی ان سے نازک سے نازک مسئلے پر اور کھل کر باتیں کرنے لگے۔ اور سرور صاحب حسبِ دستورِ سابق ان گفتگوؤں اور باتوں کو مرتب

کرتے رہے، تا آنکہ مولانا کی زندگی ہی میں مختلف موضوعات ،سیاست ، مذہب، تصوف، تاریخ اور بعض ان کی معاصر شخصیات اور بعض اسلاف کے بارے میں ملفوظات، افکار، ان کے تاثرات اور مطالعہ ومشاہدے کا اتنا ذخیرہ ہوگیا کہ 18×22 سائز پر 512 صفحے کی ایک عظیم الشان تالیف(افادات وملفوظاتِ مولانا عبیداللہ سندھی) ہمارے سامنے ہے(ایضاً،صفحہ۳۹۱)

مولانا سندھی قرآن مجید کے تعزیراتی احکام جیسے قطع ید وغیرہ اور حدیث میں جو رَجم (زانی اورزانیہ کوسنگسار کرنے) کی سزا مروی ہے، یا حدیث وسنت میں بعض انتظامی، معاشرتی اور معاشی امور مثلاً زکاۃ کی شرح کی جس طرح تعیین وتحدید کی گئی ہے،انہیں ابدی اور غیر مبدل نہیں مانتے۔زمانۂ حال کے متجددینِ اسلام اس سے بہت خوش ہوں گے،لیکن بعض جماعتوں کی اسلام پسندی اوراس کے مضمرات کے بارے میں ان کے خیالات پڑھیں گے،اوراندازہ کریں گے کہ یہ ایک صحیفۂ افادات وملفوظات ان کے افکاراور فلسفہ کے قصرِ کسروی کے لیے وہ ضربتِ اسلامی ہے، جس کے لیے ان کے پاس کوئی ڈھال نہیں، تو وہ حسبِ سابق ان کے خلاف اشتعال انگیز مضمون لکھیں گے،اورانہیں کافر، فاسق اور ملحد وبے دین ثابت کرنے کی کوشش کریں گے،اور زمانۂ حال کی اصطلاحوں میں کانگریسی، ہندو کا ایجنٹ، پاکستان کا دشمن،نظریۂ پاکستان کا مخالف، کیمونسٹ، اشتراکیت نواز، طاغوت کا معاون وغیرہ کے خطابات سے نوازا جائے گا(ایضاً،صفحہ ۳۹۲،۳۹۳)

سرورصاحب پر میں ایک بزرگ کا یہ الزام سن چکا تھا کہ انہوں نے اپنے خیالات کے لیے مولانا سندھی کو آڑ بنایا ہے۔میرے نزدیک اس الزام کی کوئی حقیقت نہیں، اس لیے کہ اس الزام کی بنیاد جس کتاب پر ہے، یعنی ’’مولانا عبیداللہ

سندھی، حالاتِ زندگی، تعلیمات اور سیاسی افکار" وہ مولانا مرحوم کی زندگی میں چھپ چکی تھی، اور نہ صرف یہ کہ کوئی ایسی شہادت موجود نہیں، جس سے مولانا سندھی کے عدمِ اطمینان اور شکایت کا پتہ چلے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ کتاب شائع ہونے کے بعد مولانا کی نظر سے گزری، اور انہوں نے اسے پسند فرمایا تھا۔ دوسری بات جس سے اس الزام کی نفی ہو جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ مولانا نے خود اپنی تحریروں، خطبوں وغیرہ میں اور انہی موضوعات پر مجملاً یا مفصلاً جو کچھ لکھا ہے، وہ اس سے متباین نہیں۔ جو بات مولانا اپنے خطبات ومقالات میں موقع ومحل کی مناسبت سے خود لکھتے ہیں، وہی بات صرف اندازِ بیان کے تفاوت سے سرور صاحب نے لکھی ہے (ایضاً، صفحہ ۴۱۵، ۴۱۶)

افادات وملفوظات اس وقت تک سرور صاحب کی آخری کتاب ضرور ہے، لیکن پہلی نہیں ہے۔ گزشتہ 44 برس سے مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم ان کا علمی موضوع ہیں۔ انہوں نے مولانا کی متعدد کتابیں مرتب بھی کیں، ان پر بہت کچھ لکھا، اور پھر ان کی اشاعت کا سروسامان بھی کیا۔ اس طرح اردو میں ان کی تالیفات، مولانا سندھی کی شخصیت، خدمات اور افکار کے بارے میں بیش بہا اضافہ ہیں۔ جہاں تک مولانا سندھی کے تعارف کا تعلق ہے، کسی ایک شخص کو اس کا کریڈٹ نہیں دیا جا سکتا، بلاشبہ اس میں دوسروں کا حصہ بھی ہے، لیکن سرور صاحب کی خدمت سب سے زیادہ ہے (ایضاً، صفحہ ۴۱۷)

مندرجہ بالا حوالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا سندھی کے آخری دور (1939ء تا 1944ء) کے افکار کے اہم ترین راوی اور شارح پروفیسر محمد سرور ہیں، اور پروفیسر صاحب کی کتابیں "مولانا عبید اللہ سندھی، حالاتِ زندگی، تعلیمات اور سیاسی افکار" اور "افادات وملفوظاتِ مولانا عبید اللہ سندھی" حضرت سندھی کے آخر دور کے افکار کو سمجھنے کے لیے معتبر

مراجع ہیں۔

اب پروفیسر سرور صاحب کی مرتبہ مذکورہ کتاب ''افادات وملفوظات'' کے چند اقتباسات بطورِ نمونہ ملاحظہ فرمائیے:

(1)...... (پروفیسر محمد سرور لکھتے ہیں): مولانا سندھی پورے تیرہ سال مکہ معظّمہ میں پڑھتے پڑھاتے، سوچتے، لکھتے اور لکھواتے رہے، اس عرصے میں ان کی اپنے اہلِ وطن اور دنیائے اسلام سے آنے والے اہلِ علم وفکر سے بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ راقم السطور کے نزدیک جب وہ 1939ء میں ہندوستان پہنچے، اور آخر میں جب وہ اپنے رب کے ہاں سدھارے، تو ان درمیانی سالوں میں انہوں نے جو کچھ فرمایا، اور لکھا، یہ حاصل تھا ان اثرات کا جنہیں سیاحتِ روس نے ایک نیا موڑ دیا تھا، اور جن کو انہوں نے مکہ کے قیام کے دوران میں ایک نظریاتی اور فکری ترتیب دی تھی (افادات وملفوظات، صفحہ ۱۹۸، ۱۹۹، بعنوان ''سوشلزم اور مذہب'' مطبوعہ: سندھ ساگر اکادمی، لاہور، تاریخِ اشاعت: 2014ء)

(2)...... راقم السطور (محمد سرور) مولانا کی زندگی کے آخری ساڑھے پانچ سالوں میں کافی عرصہ ان کی خدمت میں رہا ہے۔ جب کبھی میں ان کی خدمت میں موجود ہوتا، تو کئی کئی گھنٹے مسلسل ان کی باتیں سننے کا موقع ملتا۔ اکثر یوں ہوتا کہ صبح کے وقت چائے پر گفتگو کا سلسلہ شروع ہوتا اور دوپہر تک جاری رہتا، پھر نمازِ عصر کے بعد سے نمازِ مغرب تک اور بعد ازاں شام کے کھانے پر باتیں ہوتیں۔ بارہا ایسا بھی ہوا کہ انہوں نے کسی نازک مسئلے پر اپنی رائے کا اظہار کیا، جو ظاہر ہے کہ نئی تھی اور لوگوں کی برہمی اور جوش وغضب کا باعث بن سکتی تھی۔ مولانا نے اپنی یہ رائے ظاہر کی اور ساتھ ہی فرمادیا کہ اسے جب مناسب حالات دیکھنا، شائع کرنا۔ وہ بلاوجہ ہنگامہ کھڑا کرنے کے حامی نہ تھے۔

مثال کے طور پر ایک دفعہ فرمانے لگے: میں یہ بات برملا طور پر نہیں کہا کرتا، لیکن میرا یہ عقیدہ ہے کہ جو شخص قرآن کو سمجھے بغیر پڑھتا ہے اور یہ مانتا ہے کہ اس طرح پڑھنے سے اسے ثواب حاصل ہوگا، وہ بت پرستوں سے کم نہیں، ایک نے بت کو خدا بنالیا ہے، اور ایک نے کتاب کو خدا مانا، بت بھی ساکت اور جامد ہے، اسی طرح یہ کتاب بھی اس کے لیے ایک بت ہی ہے، کیونکہ اسے سمجھتا نہیں، اور بغیر سمجھے اس کو پڑھتا ہے۔ اب تم ہندوؤں کو تو بت پرست کہتے ہو اور اپنی طرف دیکھتے نہیں، حالانکہ بت پرستی میں تم اور وہ یکساں ہو، قرآن تفکر وتدبر کے لیے اترا ہے (ایضاً، صفحہ ۲۴۳، بعنوان ''شخصیات'')

(3)...... (پروفیسر محمد سرور لکھتے ہیں): مولانا (سندھی) کے سیاسی واجتماعی فکر کی طرح ان کا دینی فکر بھی عمر اور اس کے تجربوں کے ساتھ ساتھ وسیع سے وسیع تر اور عمیق سے عمیق تر ہوتا گیا، اور آخر میں عقیدۂ وحدۃ الوجود کے زیرِ اثر ان کا جو دینی فکر بنا، وہ سب مذاہب کو اپنے اندر لے سکتا ہے (ایضاً، صفحہ ۴۳، بعنوان ''مکہ معظّمہ میں علمی وسیاسی دلچسپیاں'')

(4)...... مولانا (سندھی) کہنے لگے کہ میں روسی اشتراکیوں کے عام آدمیوں کا نہیں کہتا، لیکن جہاں تک ان کے ذی فہم اور عقلمند افراد کا تعلق ہے، میرے نزدیک ان کو لادینی کہنا زیادتی ہے، ہاں جس کو تم دین کہتے ہو، اسے وہ نہیں مانتے، لیکن جہاں تک دین کی اصل روح اور زندگی میں اس کی کارفرمائی کا تعلق ہے، تم انہیں لادینی نہیں کہہ سکتے (ایضاً، صفحہ ۱۸۱، بعنوان ''سوشلزم اور مذہب'')

(5)...... (پروفیسر محمد سرور لکھتے ہیں): مولانا (سندھی) کی خدمت میں اتنا عرصہ رہنے اور ان کی اس قدر طویل گفتگوؤں کے دوران میں، میں نے ان کی زبان سے سوشلزم، کمیونزم یا اشتراکیت کی اس حیثیت سے کہ وہ سوشلزم، کمیونزم یا

اشتراکیت ہے، کبھی مذمت نہیں سنی (ایضاً، صفحہ ۲۴۴، بعنوان ”شخصیات“)

(6)...... مولانا (سندھی) کہنے لگے: عام دیوبندیوں کا ”سرسید“ یا ”علی گڑھ کالج“ کے متعلق جو بھی خیال رہا ہو، لیکن میں پورے یقین سے کہتا ہوں کہ شروع ہی سے دیوبند میں ایک مختصر لیکن ممتاز گروہ ایسا رہا ہے، جو علی گڑھ سے ذہنی بُعد رکھنے کے حق میں نہ تھا۔ یہ دل سے چاہتے تھے کہ یا تو علی گڑھ کو اپنی طرف کھینچیں، یا خود علی گڑھ سے قریب ہو کر اسے اپنا لیں۔ میں اسی گروہ کا فرد ہوں۔ مولانا شیخ الہند نے مجھے علی گڑھ والوں سے ملنے اور ان سے تعلقات پیدا کرنے کی اجازت دی، چونکہ وہ سمجھتے تھے کہ میں علی گڑھ والوں سے صحیح دیوبندیت کا تعارف کراسکوں گا، کیونکہ میں دیوبندی ہونے کے باوجود علی گڑھ کے ”نیچریوں“ سے بدظن نہ تھا (ایضاً، صفحہ ۴۱۱، ۴۱۲، بعنوان ”ملفوظات“)

(7)...... مولانا (سندھی) نے کہا: جہاں تک یورپین ازم کو اختیار کرنے کا تعلق ہے، میں سرسید احمد خان کا مثنیٰ ہوں۔ سرسید نے یورپی تمدن اختیار کرنے کی دعوت دی، اس کے سامنے برطانوی نمونہ تھا، میں مسلمانوں کو یورپ کی دوسری قوموں کا نظامِ تمدن اپنانے کی دعوت دیتا ہوں (ایضاً، صفحہ ۴۱۹، بعنوان ”ملفوظات“)

(8)...... (مولانا سندھی نے فرمایا): دیوبند اور علی گڑھ دونوں مکاتبِ فکر شاہ ولی اللہ کے طریقے کے وارث ہیں (ایضاً، صفحہ ۴۱۹، بعنوان ”شخصیات“)

(9)...... مولانا سندھی، سرسید کے اس اقدام کے بھی بڑے معترف تھے کہ اس نے یورپی تمدن کو اپنانے کی دعوت دی، ایک دفعہ فرمانے لگے:

سرسید کا ہندوستان کے مسلمانوں پر ایک احسان یہ بھی ہے کہ اس نے یہ محسوس کیا اور اپنے محسوسات کو ایک تحریک کی شکل دی کہ موجودہ حالات میں یورپی تمدن کو اختیار کیے بغیر اس ملک میں مسلمانوں کا قومی وجود کسی صورت میں باعزت طور

پر باقی نہیں رہ سکے گا۔سرسید کا یہ مسلک عزت وتوقیر کے قابل ہے۔اس پر چلنا اس وقت بھی ضروری تھا اور آج تو اسے اپنائے بغیر بچنے کی کوئی صورت ہی نہیں۔ باقی رہی سرسید احمد کی سیاست اور اس کا مسلکِ وفاداریٔ حکومتِ برطانیہ، بے شک سرسید بہت بڑا آدمی تھا، اس کے زیرک اور مدبر ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں۔ اس نے اپنے وقت میں اور ان حالات میں جو کچھ کیا اور حکومت کو مسلمانوں کے بارے میں مطمئن اور خوش کرنے کے لیے جو بھی راہِ عمل اختیار کی وہ اس زمانے کے حالات اور مسلمانوں کے مخصوص طبقوں کے، جن کے سرسید قدرتی طور پر اور سماجی طور پر نمائندے تھے، مفادات کے عین مطابق تھا (ایضاً،صفحہ ۳۱۷،۳۱۸،بعنوان ''سرسید احمد خان'')

(10)......اس کے باوجود کہ حکیم نورالدین، مرزا غلام احمد کو ''مسیح موعود'' مانتے تھے، اور مسلکاً احمدی وقادیانی تھے، مولانا سندھی ان کی علمی عظمت کے برابر قائل رہے۔ راقم الحروف (محمد سرور) کا خیال ہے کہ مولانا جب ان سے ملنے قادیان جاتے تھے، تو وہ ان کی قرآن فہمی اور قرآن سے ان کی غیر معمولی محبت سے بہت متاثر ہوتے (ایضاً،صفحہ ۲۵۰،بعنوان ''شخصیات'')

(11)...... [مولانا سندھی نے کہا] میں مولوی نورالدین کو واقعی بڑا آدمی سمجھتا ہوں، میں ان کے علم، تفقہ فی الدین، خلوص، ایثار، بے غرض خدمتِ دین اور سب سے بڑھ کر ان کا اپنے آپ کو ایک مقصد کے لیے وقف کردینا، ان چیزوں کا میں بڑا معترف ہوں (ایضاً،صفحہ ۳۲۸،بعنوان ''حکیم نورالدین'')

(12)...... [مولانا سندھی نے فرمایا] غلطی یہ ہوئی کہ ہمارے علمائے کرام نے احمدیت کو ایک اعتقادی مسئلہ بنادیا، اور اعتقادیات کی جنگ کبھی فیصلہ کن نہیں ہوتی، کیونکہ اس میں ''تاویلوں'' کی بڑی گنجائش ہوتی ہے اور فنِ تاویل میں احمدیوں کا

کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ تاویل کے یہ معنیٰ ہوتے ہیں کہ ایک لفظ سے آپ جو چاہیں، مرادلیں۔ احمدیت ایک سماجی مظہر (Phenomenon) ہے۔ ''تحریک ختمِ نبوت'' جیسی تحریکیں نہ پہلے اس کا کچھ بگاڑسکی ہیں، اور نہ آئندہ بگاڑ سکیں گی (ایضاً، صفحہ۳۴۷، بعنوان ''حکیم نورالدین'')

(13)...... (پروفیسر محمد سرور لکھتے ہیں) ایک دفعہ کا ذکر ہے سید ہاشمی فرید آبادی جامعہ نگر میں مولانا (سندھی) سے باتیں کررہے تھے، باتوں باتوں میں وہ کہنے لگے ہم نے حیدرآباد دکن میں فلاں قادیانی کو مسلمان کیا۔ مولانا نے سنا تو بڑے تاسف اور پردرد لہجے میں کہا کہ سید صاحب آپ بھی ایسی باتیں کرتے ہیں (ایضاً، صفحہ۲۴۵)

(14)...... (مولانا سندھی نے فرمایا) ابنِ عربی کا یہ کہنا کہ آخر میں فرعون بھی نجات پاجائے گا، صحیح ہے (ایضاً، صفحہ ۳۷۷، بعنوان ''ملفوظات، جنت ودوزخ اور فرعون کی نجات'')

اس کے علاوہ بھی مذکورہ کتاب کے متعدد اقتباسات اور ان پر تبصرہ ہماری کتاب میں شامل ہے۔ اگرچہ بعض لوگ ان چیزوں میں بے جا تاویل کرکے مسئلہ کو پیچیدہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں، چنانچہ سوشلزم کی حمایت کا بھی اس کتاب میں اور اس کے علاوہ مولانا سندھی کے دیگر مضامین میں مختلف طریقوں سے ذکر آیا ہے، جس کی تاویل کرتے ہوئے بعض حضرات کہتے ہیں کہ مولانا سندھی کی ''سوشلزم'' سے مراد ''اسلامی سوشلزم'' ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ کے مضمون کے دو مختصر اقتباسات ملاحظہ فرمائیے:

عجیب تماشا ہے، ایک طرف تو اسلام کا نام لیا جارہا ہے، اور ایک ہی سانس میں اس کے ساتھ سوشلزم کا نام بھی لیا جاتا ہے، اور عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے سوشلزم کے ساتھ ''اسلامی'' کا پیوند لگایا جاتا ہے، اور ''اسلامی

سوشلزم‘‘ کی پرفریب تعبیر اختیار کی جاتی ہے۔’’اسلام‘‘ کے ساتھ تو کسی بھی پیوند لگانے کی ضرورت ہی نہیں۔اسلام ایک کامل ومکمل نظامِ حیات ہے، جس میں عبادات، معاملات ، اقتصادیات ، معاشیات اور معاشرت ومعیشت کی تمام چیزیں خود بخود آ جاتی ہیں۔دراصل اس کفر کو چھپانے کے لیے یہ دھوکہ دیا جاتا ہے،اور پیوند کاری کی جاتی ہے،تاکہ کمیونزم کے لیے زمین ہموار کی جائے،اور کل کمیونزم کا نام’’اسلامی کمیونزم‘‘ رکھا جاسکے۔میں اسلامی سوشلزم پر کوئی فتویٰ تو نہیں لگانا چاہتا،لیکن یہ واضح کردینا ضرور چاہتا ہوں کہ اسلامی تعبیرات کو چھوڑ کر اس قسم کی فریب کارانہ تعبیرات کو اختیار کرنا یقیناً کسی خطرناک فتنہ کی غمازی ضرور کرتا ہے۔ ع

حاجتِ مشاطہ نیست روئے دل آرام لا

(بصائر وعبر، حصہ اول، صفحہ۳۷، ناشر: مکتبہ بنوریہ، بنوری ٹاؤن، کراچی)

ہمیں شبہ ہے کہ سوشلزم کا نعرہ لگانے والے یا تو سوشلزم سے واقف نہیں، یا اسلام سے واقف نہیں، اگر واقف ہیں، تو قوم اور ملک کو تضاد اور نفاق میں مبتلا کرنے سے کیا فائدہ؟ شاید ان کو معلوم نہیں کہ قوموں کی زندگی میں تضاد اور نفاق سمِ قاتل ہے (ایضاً، حصہ دوم، صفحہ۱۰۵)

اسی کے ساتھ مولانا سعید احمد اکبرآبادی صاحب کے ایک مضمون کا درجِ ذیل اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیے:

سوویٹ روس کی طرف سے سوشلزم کا پروپیگنڈہ ہوا،تو ہم میں کتنے ہی تھے، جو اس کی آن بان سے مرعوب ہوکر برملا اسلام کے اقتصادی نظام کو سوشلزم پر منطبق کرنے لگے، اور انہوں نے دعویٰ کیا کہ اسلام میں اور سوشلزم میں بنیادی طور پر (یہ بھی محض برسبیلِ احتیاط) کوئی فرق نہیں ہے۔میں ان دوستوں کی نیت پر کوئی

حملہ نہیں کرتا، ممکن ہے کہ یہ سب باتیں نیک نیتی کے ساتھ ہوں، اور اس غرض سے ہوں کہ وہ اسلام کو ایک عالمگیر اور دنیا کے ترقی یافتہ نظریوں کا ساتھ دینے والا مذہب ثابت کرنا چاہتے ہوں، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ان کا یہ طرزِ عمل اسلام کے لیے حد درجہ نقصان رساں ہے، اس کے تو معنیٰ یہ ہوئے کہ اسلام بجائے خود کوئی حقیقتِ ثابتہ نہیں، بلکہ وہ ایک ایسی ربڑ ہے، جس کو کھینچ تان کر وہ ہر قد و قامت پر راست کر سکتے ہیں، اور وہ ایک ایسا مبہم و مجہول دستور ہے، جس کی تشریح ہر زمانہ میں اس کے جدید رجحانات کے مطابق ہو سکتی ہے (ماہنامہ ''الفرقان'' بریلی، شاہ ولی اللہ نمبر، مرتبہ: مولانا محمد منظور نعمانی، صفحہ ۳۶۹، جلد ۷، شمارہ نمبر ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، بابت رمضان، شوال، ذیقعدہ، ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ، مضمون ''انقلابی یا مجدد؟'' از مولانا سعید احمد اکبر آبادی)

''افادات وملفوظات'' میں مولانا سندھی خود اپنے آپ کو سرسید احمد کا مثنیٰ قرار دیتے ہیں، اور ان سے بدظن نہ ہونے کا اعتراف فرماتے ہیں، اور حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ کا یہ ملفوظ ہم اپنی کتاب میں نقل کر چکے ہیں کہ:

میں تو کہا کرتا ہوں کہ مولوی عبیدُ اللہ صاحب، سرسید احمد تھے، مگر مولوی صاحب میں قوتِ عملی نہ تھی، صرف رائے ہی رائے تھی (کلمۃ الحق، یعنی ملفوظاتِ اشرفیہ، قسط ہشتم، ص ۱۳۱، مجلس ۷ شوال المکرّم ۱۳۴۴ھ)

مذکورہ حوالہ جات اور تفصیلات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مولانا سندھی کے حوالہ سے پروفیسر سرور صاحب کی تالیفات ومرتب کردہ کتب ومضامین ''خطبات ومقالات'' اور ''افادات وملفوظات'' کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اور نہ ہی متنازع باتوں کا الزام صرف پروفیسر سرور صاحب کے سر پر تھوپا جا سکتا ہے۔

جب مولانا سندھی سے براہِ راست استفادہ واملاء اور نقل کرنے والا ان کا معتمد وہمراز شاگرد اپنے استاذ کی ترجمانی کر رہا ہو، جس پر خود اس کے استاذ کو بھی اعتماد ہو، اور ان کی طرف سے

اس کی تصریح موجود ہو، تو کسی تیسرے شخص کے یہ دعویٰ کرنے سے اس میں تبدیلی نہیں لائی جاسکتی کہ یہ افکار یا ترجمانی مولانا سندھی کی نہیں، بلکہ ان کے مذکورہ شاگرد کی اپنی طرف سے اختراع ہے۔

اور جناب ماہر القادری صاحب کے مضمون میں آگے آتا ہے:

''اس بدگمانی کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ محمد سرور صاحب نے مولانا عبید اللہ سندھی کے عقائد وافکار کی ترجمانی میں خیانت کی ہوگی''

رہا یہ شبہ کہ پروفیسر سرور صاحب کی مرتب کردہ کتابوں یا مضامین میں کچھ تضادات وتعارضات بھی پائے جاتے ہیں، اور کچھ امور مولانا سندھی کے اپنے ہاتھ سے تحریر شدہ مضامین سے بھی مختلف ہیں، تو اس پر کلام آگے آتا ہے۔

جہاں تک مولانا سندھی کی طرف منسوب تفسیری امور کا تعلق ہے، تو بعض امور کی تردید تو حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ کے مستقل رسالہ ''التقصیر فی التفسیر'' میں موجود ہے، جو ہماری کتاب میں شامل ہے۔

اس کے علاوہ مولانا سندھی کے حوالہ سے تفسیری مواد میں قابلِ اعتراض امور اور شاذ افکار زیادہ تر اور اکثر وبیشتر ''تفسیر المقام المحمود'' ''تفسیر الہام الرحمٰن'' اور ''قرآنی شعور انقلاب'' نامی کتابوں وغیرہ کی شکل میں منظرِ عام پر آئے ہیں۔

اور مذکورہ بالا کتب ومضامین مولانا سندھی کے معتمد تلامذہ کی املاء یا تحریر کردہ ہیں، جن پر خود مولانا سندھی کے علاوہ بعض دیگر حضرات کو بھی اعتماد ہے۔ اس سلسلہ میں چند تفسیری کتب ورسائل پر تبصرہ کیا جاتا ہے:

تفسیر ''المقام المحمود'' کا ذکر

مولانا سندھی کے حوالہ سے تفسیر کے سلسلہ میں انتہائی متنازع اور شاذ افکار کی حامل پہلی تفسیر ''المقام المحمود'' ہے، جس میں جہنم میں خلود اور دوام نہ ہونے اور آدم کی جنت موجودہ کشمیر

ہونے وغیرہ جیسے نظریات کا ذکر ہے۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی صاحب (جنہیں بعض اہلِ علم نے مولانا سندھی کے علوم وافکار اور تعلیمات کے صحیح ترجمانوں میں شامل کیا ہے) ''تفسیر المقام المحمود'' کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ:

مولانا (سندھی) نے قرآن مجید کی تفسیر بھی لکھنی شروع کی تھی، جو عجیب وغریب اسرار ونکات پر مشتمل تھی۔ روس کے ایک نہایت وسیع النظر عالم علامہ موسیٰ جارُ اللہ (جن سے عرصہ ہوا، بار ہا راقم الحروف کو دہلی اور دوسرے مقامات پر ملاقات اور گفتگو کا شرف حاصل رہا ہے) مولانا (سندھی) کے تلمیذِ خاص تھے، اور انہوں نے مولانا سے باقاعدہ قرآن مجید اور حجۃ اللہ البالغۃ کا درس لیا تھا، اور چونکہ ان کا حافظہ نہایت قوی تھا، اس لیے مولانا کی تقریریں یادداشتوں کی صورت میں قلمبند ہونے کے علاوہ انہیں حرف بحرف یاد تھیں۔ سخت ضرورت تھی کہ مولانا کا تفسیری سرمایہ، جو کچھ بھی ہے، اسے طبع کیا جائے، تاکہ اس کا افادہ عام ہو۔

چنانچہ مولانا کی تفسیر کے بعض اجزاء اربابِ علم کے اہتمام سے طبع ہو چکے ہیں، لیکن اس سلسلہ میں سب سے اہم اور ٹھوس کتاب وہ ہے، جو اس وقت آپ کے پیشِ نظر ہے (یعنی تفسیر المقام المحمود)

دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ فاضل مرتب کو اس اخلاص اور محنت کا اجرِ عظیم عطا فرمائے، اور ان کی اس کوشش کو حسنِ قبول سے نوازے۔ آمین۔

سعید احمد اکبر آبادی: ڈائریکٹر شیخ الہند اکادیمی، دارالعلوم دیوبند، 07 دسمبر 1982ء (تفسیر المقام المحمود، ج ا ص ۲۷، مطبوعہ: مکی دار الکتب، لاہور، اشاعت: ستمبر 1997ء)

مولانا سعید احمد اکبر آبادی مختصر عرصے کے لیے خود بھی مولانا سندھی کے شاگرد رہے ہیں۔ اور انہوں نے مولانا سندھی کے دفاع میں ایک کتاب ''مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے

ناقد'' بھی لکھی ہے۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی اگر مولانا سندھی کے علوم وافکار اور تعلیمات کے صحیح اور معتمد ترجمان ہیں، تو تفسیر الہام الرحمٰن اور اس کے مرتب علامہ موسیٰ جار اللہ صاحب کی وہ توثیق فرما رہے ہیں، اور تفسیر المقام المحمود کو وہ سب سے اہم اور ٹھوس کتاب قرار دے رہے ہیں، پھر ان کے مقابلہ میں کسی بعد کے شخص کا اس تفسیر کے مولانا سندھی کی طرف منسوب اور غیر معتمد ہونے کا حکم لگانا کیا درجہ رکھتا ہے؟

اس موقع پر یہ بات بھی غور طلب ہے کہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی، پروفیسر سرور صاحب کی تحریر کردہ کتاب ''مولانا عبید اللہ سندھی'' پر جزوی نقد فرما چکے ہیں، لیکن تفسیر ''الہام الرحمٰن'' اور ''المقام المحمود'' میں جو انتہائی شاذ افکار موجود ہیں، جن کے متعلق کوئی مؤثر تاویل بھی نظر نہیں آتی، ان کے بارے میں وہ کیا فرمائیں گے؟ اس کا جواب دارِ فانی میں مولانا سے ملنا ناممکن ہے، اس لیے کہ وہ اب حیات نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

ڈاکٹر عبد الواحد ہالیپوتہ، ایم۔اے (بمبئی) ڈی۔ فل (آکسفورڈ) فاضل علومِ دینیہ مدرسہ مظہر الحق (نصر پور، سندھ) صدر شعبہ علومِ دین وتہذیبِ اسلام، سندھ یونیورسٹی، حیدر آباد (سندھ) تفسیر ''المقام المحمود'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

> یہ تفسیر مولانا عبید اللہ سندھی، مکہ معظّمہ کے پر انوار ماحول میں اپنے تلامیذ اور محبینِ قرآن کے سامنے پیش کرتے تھے، اور ان کے تلمیذ اور سفرِ کابل کے رفیق مولانا عبد اللہ لغاری صاحب روزانہ قلمبند کرتے تھے، حتّٰی کہ دو سال کی مسلسل محنت اور جفاکشی سے یہ ساری تفسیر قلمبند ہوگئی۔ اس کی نقلیں دہلی، لاہور، کراچی وغیرہ میں بھی موجود ہیں، لیکن اس کا اصل نسخہ، جو خود مولانا لغاری صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، سندھ یونیورسٹی میں موجود ہے............
>
> تفسیرِ قرآن، مولانا (سندھی) صاحب کا عمر بھر مرغوب ترین مشغلہ رہا ہے، ان کی

ابتدائی تفسیر، جو انہوں نے قیامِ دہلی کے دوران میں پہلی عالمی جنگ سے پہلے مرتب کی تھی، ان کی نقلیں سندھ یونیورسٹی، حیدر آباد، اور دوسری جگہوں میں موجود ہیں، لیکن یہ تفسیر (المقام المحمود) جو اَب شائع ہو رہی ہے، اس وقت لکھی گئی تھی، جبکہ مولانا (سندھی) صاحب کا تجربہ ومشاہدہ اور علمی معیار بہت بڑھ چکا تھا۔اس وقت تک ان کا نقطۂ نظر بہت ہی وسیع ہو چکا تھا، اور ان کا قلب دیارِ حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) اور فیوض الحرمین کے انوار کا منبع بن چکا تھا (تفسیر المقام المحمود، ج۱ص۶۷، ۶۸ بعنوان ''تفسیر المقام المحمود کی اہمیت'' مطبوعہ: مکی دار الکتب، لاہور، اشاعت: ستمبر 1997ء)

ڈاکٹر صاحب موصوف بھی مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے حوالہ سے ایک ذمہ دار شخص ہیں۔مولانا سندھی کی وفات کے بعد تفسیر ''المقام المحمود'' کے جامع، مولانا عبداللہ لغاری تقریباً 6 سال سندھ یونیورسٹی کے بعض اساتذہ اور شاگردوں کو قرآن پاک کی تفسیر وحکمت سمجھانے کے لیے یونیورسٹی میں ڈاکٹر (نبی بخش) بلوچ اور ڈاکٹر ہالیپوتہ صاحبان کے یہاں مقیم رہے، بلکہ آخر کے تین سال ڈاکٹر ہالیپوتہ صاحب کے مکان پر ہی مقیم رہے، اور وہاں سے قرآن شریف اور حکمتِ ولی اللّٰہی کی تعلیم جاری رکھی۔آخر میں سندھ یونیورسٹی میں ایم۔اے کے طلبہ کو تفسیر پڑھانے کے لیے معلم مقرر ہوئے (تفسیر المقام المحمود، ج۱ص۸۰ بعنوان ''تفسیر کے جامع مولانا عبداللہ لغاری مرحوم کے حالات'' مطبوعہ: مکی دار الکتب، لاہور، اشاعت: ستمبر 1997ء)

ڈاکٹر ہالیپوتہ صاحب جو مولانا سندھی اور مولانا عبداللہ لغاری کے براہِ راست شاگرد ہیں اپنے مشاہدہ کی روشنی میں تفسیر ''المقام المحمود'' کو مولانا سندھی کی معتبر املائی تفسیر قرار دے رہے ہیں، اور اس کو مولانا سندھی کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد کے زمانہ سے متعلق قرار دے رہے ہیں، اور یہی وہ دور ہے جس میں مولانا سندھی نے ایسے شاذ افکار کا اظہار کیا جس سے مستند اکابر اور اصحابِ علم کا ایک بڑا طبقہ اتفاق نہیں کرتا۔ان اصحابِ علم میں سے متعدد حضرات نے حرم شریف میں حاضر ہو کر خود مولانا سندھی کی زبان سے ان کے شاذ افکار

سنے، اوران کی تردید کی، بلکہ بہت سے بدظن بھی ہوئے۔ظاہر بات ہے کہ مذکورہ تفسیر میں اسی زمانے کے افکار املائی شکل میں درج ہوئے ہیں، اس لیے مذکورہ کتاب میں مولانا سندھی کے شاذ افکار موجود ہونے پر تعجب نہیں ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری صاحب لکھتے ہیں:

(مدرسہ دارالرشاد، پیر جھنڈا، جس کے مہتمم، وصدر مدرس مولانا عبیداللہ سندھی تھے، اس مدرسہ میں) مولانا عبداللہ لغاری، فارسی کے مدرس تھے۔یہ ہجرت کر کے کابل چلے گئے تھے، پھر ہندوستان واپس آ گئے تھے، اور جب مولانا سندھی، روس، ترکی ہوتے ہوئے حجاز پہنچ گئے، تو 1931ء یا 1932ء میں مولانا لغاری بھی حجاز گئے، اور تقریباً تین سال مولانا سندھی کی خدمت میں رہ کر مولانا سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی ''الخیر الکثیر'' اور ''حجۃ اللہ البالغۃ'' پڑھیں، اور تفسیرِ قرآن پڑھی، اور ''المقام المحمود'' کے نام سے مولانا سندھی کے امالی تفسیر اردو میں مرتب فرمائے۔1353ھ (1943ء) میں یا اس کے بعد کسی وقت سندھ لوٹ آئے تھے، سندھ یونیورسٹی (جام شورو) حیدرآباد کے قیام کے بعد وہ اس سے وابستہ ہو گئے تھے۔ان کی تفسیر کا آخری پارۂ عم پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب نے مرتب کیا تھا، شائع ہو گیا ہے (''امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی، حیات وخدمات'' صفحہ ۵۹، مطبوعہ: دار الکتاب، اردو بازار، لاہور، اشاعتِ دوم: مئی 2016ء)

ڈاکٹر شاہ جہاں پوری صاحب موصوف مزید لکھتے ہیں:

دوسری مکمل تفسیرِ قرآن وہ ہے، جسے مولانا عبداللہ لغاری مرحوم نے اردو میں منضبط کیا تھا۔مولانا لغاری مرحوم دارالرشاد (گوٹھ پیر جھنڈا) میں ابتدائی زمانے میں مدرس فارسی تھے۔انہوں نے طویل عرصہ مولانا سندھی کی صحبت میں بسر کیا تھا۔مولانا سے استفادے کے انہیں بہت مواقع ملے تھے۔مکہ مکرمہ میں تھے کہ

فیضانِ الٰہی مساعد ہوئی، اور انہوں نے مولانا سندھی سے پورا قرآن پڑھا، اور مولانا کے افاداتِ قرآنی کو مرتب کرلیا۔ اردو میں مولانا سندھی کے افادات واما لی قرآن کا یہ سب سے بڑا مجموعہ ہے، جو مولانا لغاری مرحوم کی توجہ اور محنت سے مرتب ہوگیا۔ اس کی کئی نقول پاکستان میں کئی کتب خانوں میں ہیں، ان کی اشاعت کا سلسلہ بھی جاری ہوچکا ہے (''امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی، حیات وخدمات''

صفحہ ۲۵۰، مطبوعہ: دارالکتاب، اردو بازار، لاہور، اشاعتِ دوم: مئی 2016ء)

مذکورہ حوالہ جات سے معلوم ہوا کہ تفسیر ''المقام المحمود'' کو املاء کرنے والے مولانا عبداللہ لغاری صاحب، مولانا سندھی کے آخری دور کے سفر وحضر کے تلمیذ اور خاص شاگرد اور ان کی معتمد شخصیت ہیں، اور اردو زبان میں مولانا سندھی کے امالی وافادات کا یہ سب سے بڑا مجموعہ ہے، جس کی شہادت مولانا سندھی کے براہِ راست معتمد تلامذہ بھی دے رہے ہیں، پھر ان کے مقابلہ میں بعد کے کسی شخص کا مولانا سندھی کی طرف اس کی نسبت کا انکار کرنا اور اس تفسیر میں مذکور شاذ افکار کی مولانا سندھی کے بجائے ناقل وغیرہ کی طرف نسبت کرنا چہ معنیٰ دارد۔

پس گزشتہ تحریرات وعبارات اور حوالہ جات سے بعض حضرات کے اس شبہ کا بھی ازالہ ہوگیا کہ جو باتیں ''تفسیر المقام المحمود'' میں موجود ہیں، ان پر ہرگز اعتماد نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ اس کے مؤلف اس پائے کی شخصیت نہیں تھے، اس لیے ان کے ذوق کی باتیں بھی اس میں شامل ہوگئی ہیں، کیونکہ اولاً تو جب مولانا سندھی کے اصل تلامذہ اور متعدد اہلِ علم وذمہ دار حضرات اس تفسیر کے مولانا سندھی کے املاء پر مبنی ہونے اور املاء کرنے والے کے مولانا سندھی کا معتمد تلمیذ اور مولانا سندھی کے قائم کردہ مدرسہ کے استاذ ہونے کا اعتراف کرچکے ہیں، اور مولانا سندھی کے ایک دوسرے معتمد شاگرد اور فاضل وعالم مولانا سعید احمد اکبر آبادی اس کو سب سے اہم اور ٹھوس کتاب قرار دے چکے ہیں، پھر کسی شخص کا بلا دلیل ان امالی کو غیر معتمد قرار دینا کیا معنیٰ رکھتا ہے؟

ثانیاً جب کسی شخص کا معتمد تلمیذ جو کہ عالمِ دین بھی ہو، اپنے استاذ کی علمی گفتگو کا املاء کر رہا ہو، تو اس کے بارے میں ذاتی ذوق واہلیت وغیرہ جیسے مبہم دعوے کو بنیاد بنا کر املاء کو غیر معتمد قرار دینا کیا اہمیت رکھتا ہے؟

ثالثاً کسی عالمِ دین اور تلمیذِ خاص کے متعلق بلا دلیل یہ حکم لگانا کہ اس میں صحیح املاء کی صلاحیت وذوق نہیں تھا، لیکن خود استاد اپنے اس شاگرد سے روزانہ محنت وجفاکشی سے قلمبند اور املاء کرنے کو گوارا کر رہا ہو، یہ ''توجیه القول بما لایرضی به القائل'' کے قبیل سے زیادہ معلوم نہیں ہوتا۔

تفسیر ''الہام الرحمٰن'' کا ذکر

مولانا سندھی کے انتہائی متنازع اور شاذ افکار کے حوالہ سے دوسری تفسیر ''تفسیر الہام الرحمٰن'' ہے، جو کہ مولانا سندھی کے شاگردِ خاص علامہ موسیٰ جار اللہ کی املاء کردہ ہے، جس میں حیاتِ عیسیٰ ونزولِ عیسیٰ کے انکار، اور امام مہدی کی آمد کے انکار جیسے نظریات ہیں۔ اس تفسیر کے بارے میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے حوالہ سے مندرجہ ذیل عبارت اوپر گزر چکی ہے:

> مولانا (سندھی) نے قرآن مجید کی تفسیر بھی لکھنی شروع کی تھی، جو عجیب وغریب اسرار ونکات پر مشتمل تھی۔ روس کے ایک نہایت وسیع النظر عالم علامہ موسیٰ جارُ اللہ (جن سے عرصہ ہوا، بارہا راقم الحروف کو دہلی اور دوسرے مقامات پر ملاقات اور گفتگو کا شرف حاصل رہا ہے) مولانا (سندھی) کے تلمیذِ خاص تھے، اور انہوں نے مولانا سے باقاعدہ قرآن مجید اور حجۃ اللہ البالغۃ کا درس لیا تھا، اور چونکہ ان کا حافظہ نہایت قوی تھا، اس لیے مولانا کی تقریریں یادداشتوں کی صورت میں قلمبند ہونے کے علاوہ انہیں حرف بحرف یاد تھیں۔ سخت ضرورت تھی کہ مولانا کا تفسیری سرمایہ، جو کچھ بھی ہے، اسے طبع کیا جائے، تاکہ اس کا افادہ عام ہو۔

چنانچہ مولانا کی تفسیر کے بعض اجزاء اربابِ علم کے اہتمام سے طبع ہو چکے ہیں

(تفسیر المقام المحمود، ج ۱ ص ۲۷)

قارئین نوٹ کریں کہ مولانا سندھی کے شاگرد اور مداح ایک عالمِ دین، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، نہ صرف یہ کہ ''تفسیر الہام الرحمٰن'' کے املاء کرنے کو مستند قرار دے رہے ہیں، بلکہ اس املاء کرنے والے کو املاء کرنے کے علاوہ مولانا سندھی کی تقریروں کو حرف بحرف یاد کرنے والا بھی قرار دے رہے ہیں۔

مولانا سندھی کے معتمد خاص پروفیسر محمد سرور صاحب لکھتے ہیں:

شیخ جار اللہ نے مولانا سے قرآن پڑھنے کی خواہش کی، چنانچہ مولانا نے سارا قرآن شیخ کو پڑھایا۔ موصوف نے مولانا کی یہ ساری تفسیر عربی زبان میں قلمبند کر لی۔ جب شیخ جار اللہ ہندوستان آئے، تو ان کی اس تفسیر کی بہت سی نقلیں کی گئیں، جو کئی کتب خانوں میں اب موجود ہیں۔

شیخ موسیٰ جار اللہ عالمِ اسلام کی ایک مشہور شخصیت تھے۔ ان کی تصنیفات عربی، فارسی اور ترکی میں ہیں۔ مصر کے علمی و دینی حلقوں میں وہ آج سے نصف صدی سے بھی قبل بڑے معروف تھے، ان کی آخری عمر ہندوستان میں گزری (افادات وملفوظات، صفحہ ۱۴۱، بعنوان ''مکہ معظّمہ میں علمی وسیاسی دلچسپیاں'' مطبوعہ: سندھ ساگر اکادمی، لاہور، تاریخِ اشاعت: 2014ء)

ملاحظہ فرمایئے کہ مولانا سندھی کے ایک دوسرے خاص اور معتمد تلمیذ بھی علامہ موسیٰ جار اللہ اور ان کی املائی تفسیر پر اعتماد کا اظہار کر رہے ہیں۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری صاحب لکھتے ہیں:

علامہ موسیٰ جارُ اللہ، مشہور روسی عالم تھے۔ 1923ء میں پہلی بار مولانا سندھی کی ان سے ماسکو میں اور پھر لینن گراڈ میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت سے وہ مولانا

سندھی کے رسوخ علمی، علومِ قرآنی میں گہری نظر اور ان کی ذہانت اور باریک بینی کے بہت قائل ہو گئے تھے۔ انہوں نے مولانا سندھی سے از ''الحمد'' تا ''والناس'' قرآن حکیم کی تفسیر پڑھی، اور عربی میں اسے مکمل طور پر قلم بند کر لیا۔ اس کے بعض حصے بھوپال اور پاکستان سے چھپ گئے ہیں۔ علامہ مرحوم نے ہندوستان کا سفر بھی کیا تھا۔ ان کی بدولت مولانا سندھی کی علمی حیثیت کا علماء کے حلقے میں خاص تعارف ہوا۔ مولانا سندھی ازراہِ تفنن فرمایا کرتے تھے کہ میں ان کا شکر گزار ہوں، انہوں نے میرے وطن میں مجھے متعارف کرایا۔

علامہ موسیٰ جارُ اللہ نے مکہ مکرمہ کے سفر میں مولانا سندھی کی خدمت میں حاضری اور استفادہ وتالیفِ امالی وافاداتِ قرآن کی تفصیلات بیان فرمائی ہیں۔ یہ واضح رہے کہ علامہ موسیٰ جار اللہ، مولانا سندھی سے تفسیر پڑھنے سے پہلے ان کے بہ زمانہ قیام روس، لینن گراڈ کے سفر (1923ء) میں اور بہ زمانہ قیام ترکی (1926ء) استنبول میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی متعدد کتب کا مطالعہ حضرت مولانا سندھی کی خدمت میں رہ کر کر چکے تھے اور ان کے مطالب سے واقف ہو چکے تھے۔ 1937ء میں وہ مکہ مکرمہ پہنچے، اور مولانا سندھی کو فرصت وفراغت میں پایا، تو انہیں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فلسفے کی روشنی میں قرآن مجید کی تفسیر پڑھنے کا شوق پیدا ہوا، اور ان کے اصرار پر مولانا سندھی نے کمالِ شوق کے ساتھ انہیں تفسیر پڑھانا شروع کیا (''امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی، حیات وخدمات، صفحہ ۲۴۶، مطبوعہ: دار الکتاب، اردو بازار، لاہور، اشاعتِ دوم: مئی 2016ء)

تفسیر ''الہام الرحمٰن'' کے بارے میں علامہ موسیٰ جارُ اللہ خود لکھتے ہیں:

وبعد ان حصل عند شيء من فلسفة الامام ولى الله، رغبت فى الزيادة، وعرضت رغبتى لمولانا الاستاذ الامام السندى، ففرح

وابدی رغبة اکثر من رغبتی.

فبسملنا وأخذنا فی تفسیر الکتاب الکریم علی اصول فلسفة الامام ولی الله، کل یوم بعد طلوع الشمس الی صلاة الظهر او الیٰ صلاة العصر، کان یملی بلغته العربیة ، وکنت اکتب واجتهد ان لایفوتنی حرف ولا کلمة، فکتبت فی مدة مائة وخمسین یوم الفین واربع مائة صفحة علی مقدار صفحة هذه الکراسة .

(من ۱۸ جمادی الاولی یوم الاثنین سنة ۱۳۵۶ الیٰ ۱۳ من ذیقعدة ۱۳۵۶.۲۶ من یولیو سنة ۱۹۳۷ الیٰ ۱۳ من ینایر ۱۹۳۸)

کان الاستاذ السندی لایسأم، وکنت ازداد نشاطا فی الاستماع والکتابة ، وان کنت لمریضا شدید المرض.

فی ختام الدرس شکرت الامام السندی شکرا بقلبی ولسانی، وشکرنی الامام شکرا ازید من شکری الف مرة وزیادة، لکرمه ، ولما کان یراه من ثباتی، ونشاطی وعظیم اجتهادی، ولما کان یراه من امالیه کلها کتبت وضبطت بتمام الاهتمام(الهام الرحمن فی تفسیر القرآن عربی، من افادات الامام السندی عبیدالله ، التی تلقاها منه :العلامة موسیٰ جارُ الله، المجلد الاول، صفحه ۴،۵، عنیٰ بنشره :ابوسعید غلام مصطفی السندی ،سکریتر"بیت الحکمت " بکراتشی، مطبوعة: ایجوکیشنل پریس، کراچی)

اور ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری صاحب ’’الہام الرحمٰن فی تفسیر القرآن‘‘ کے اردو ترجمہ سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میں نے امام شاہ ولی اللہ کے فلسفے کے مطابق قرآن کریم کی تفسیر کو اپنانے میں پوری پوری کوشش کی۔ ہر روز طلوعِ آفتاب سے لے کر ظہر کی نماز یا عصر کی نماز

تک امام سندھی سے استفادے کا یہ سلسلہ جاری رہتا۔ وہ عربی میں جو کچھ فرماتے، میں اس کو لکھ لیتا، اور میری پوری پوری کوشش تھی کہ اس املاء وکتابت میں ایک جملہ بھی نہ چھوٹنے پائے، چنانچہ میں نے ایک سو پچاس دنوں میں ایک ہزار چار سو صفحات لکھ ڈالے، 18 / جمادی الاولیٰ، پیر کے دن 1356ھ سے لے کر 13 ذیقعدہ 1356ھ تک (26 جولائی 1937ء سے لے کر 3 جنوری 1938ء تک) یہ کام میں نے انجام کو پہنچا دیا۔

میرے استاد مولانا سندھی املاء کرانے سے تھکنے کا نام نہ لیتے، اور میری خوشی کا یہ عالم تھا کہ مجھ میں سننے اور لکھنے کا اشتیاق بڑھتا ہی جاتا تھا، باوجود اس کے کہ بعض اوقات میں سخت بیمار ہوتا تھا۔ جب میں درس سے فارغ ہوا تو میں نے امام سندھی کا تہِ دل سے شکریہ ادا کیا، لیکن میرے اس شکریے سے ہزار گنا زیادہ امام سندھی نے میرا شکریہ ادا کیا۔ یہ ان کا کرم تھا کہ جب انہوں نے میرا عزم وثبات، میری مسرت وخوشی اور میری کوشش بلیغ دیکھی، تو بہت خوش ہوئے۔ جب امام سندھی نے اپنے امالی کو پوری طرح دیکھ لیا، اور یہ بھی دیکھا کہ میں نے اس سلسلے میں ضبط ونظم پر پوری توجہ دی ہے، اور پورے اہتمام سے لکھا ہے، تو وہ بہت خوش ہوئے، اور اپنی مسرت کا اظہار کیا (الہام الرحمٰن فی تفسیر القرآن، ناشر مولانا محمد معاویہ، کبیر والا، ضلع ملتان، بحوالہ ''امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی، حیات وخدمات'' صفحہ ۲۴۸، ۲۴۹، مطبوعہ: دارالکتاب، اردو بازار، لاہور، اشاعتِ دوم: مئی 2016ء)

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری صاحب، علامہ موسیٰ جار اللہ کے تفسیری امالی کے بارے میں لکھتے ہیں:

تالیف شدہ امالی کو مولانا (سندھی) نے دیکھ لیا تھا کہ ان کے ضبط وکتابت میں سامع نے کوتاہی نہیں کی، اور اس ذمہ داری کے معائنہ کے بعد وہ مطمئن ہوئے

تھے، اور اپنی مسرت کا اظہار کیا تھا (''امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی، حیات وخدمات'' صفحہ ۲۵۰، مطبوعہ: دار الکتاب، اردو بازار، لاہور، اشاعتِ دوم: مئی 2016ء)

نیز لکھتے ہیں:

مولانا سندھی مرحوم کی مشہور عربی تفسیر الہام الرحمٰن کی جلد اول پارہ اول، مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی نے مرتب کر کے شائع کی، اس پر مولانا قاسمی کا عالمانہ مقدمہ خاص مطالعہ کی چیز ہے۔ اس میں سندھ کی پوری علمی ودینی تاریخ اختصار کے ساتھ مرتب ہوگئی ہے۔ الہام الرحمٰن جلد اول کا سندھی ترجمہ بھی بیت الحکمت کراچی کی جانب سے شائع کیا۔ الہام الرحمٰن مولانا سندھی کی تفسیر ہے، جسے ان کے شاگرد موسیٰ جار اللہ روسی عالم دین نے قیامِ مکہ مکرمہ کے زمانے میں مولانا سندھی کے الفاظ میں قلم بند کیا تھا (''امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی، حیات وخدمات'' صفحہ ۳۵۹، مطبوعہ: دار الکتاب، اردو بازار، لاہور، اشاعتِ دوم: مئی 2016ء)

ڈاکٹر شاہ جہاں پوری صاحب مزید لکھتے ہیں:

مولانا (سندھی) کے امالی ''الہام الرحمٰن فی تفسیر القرآن'' مؤلفہ: علامہ موسیٰ جار اللہ کے بارے میں علامہ مرحوم نے صراحت کی ہے کہ اسے مولانا مرحوم کے الفاظ میں مرتب کیا گیا ہے، اور قرآن حکیم کی تفسیر میں ایک ایک لفظ جو مولانا کی زبان مبارک سے نکلا، اسی وقت ان کے سامنے نہایت کوشش سے ضبط تحریر میں لے آیا گیا۔ یہ امالی مولانا سندھی کی نظر سے گزرے تھے، اور علامہ کی محنتِ تالیف اور اہتمامِ صحت پر حضرت سندھی نے اپنے اطمینان ومسرت کا اظہار فرمایا تھا۔ ان امالی کی تالیف اور مولانا سندھی کی نظرِ اصلاح واظہارِ مسرت کا بیان حضرت علامہ نے خود ایک تحریر میں فرمایا ہے، جس کا حوالہ '' مکہ مکرمہ میں مولانا سندھی کا قیام اور مصروفیات'' میں گزر چکا ہے۔

حضرت علامہ موسیٰ جار اللہ نے جو امالی تفسیر تحریر فرمائے، ان کی کئی خصوصیات ہیں، ان پر نظر رہنی چاہیے۔

۱- اصلاً یہ امالی عربی میں بیان ہوئے تھے، اور عربی ہی میں ضبطِ تحریر میں لائے گئے تھے۔

۲- علامہ مرحوم نے پوری کوشش کی کہ انہیں مفسر کی زبان ہی میں قلم بند کیا جائے، اور اس کے بیان کا کوئی جملہ کتابت میں چھوٹنے نہ پائے۔

۳- دورانِ تفسیر کوئی بیان معترضہ آ جاتا، تو اسے تفسیرِ قرآن سے الگ ضبط کیا جاتا۔ یہ معترضات وقت کے سیاسی افکار و مسائل کے بارے میں ہوتے۔ ان کے لیے مولانا خود فرما دیتے تھے کہ یہ معترضات تفسیر کا حصہ نہیں۔ البتہ جہاں سیاستِ اجتماعیہ کی بحث ہوتی، تو اس کی صاف تصریح و وضاحت فرما دیتے تھے۔ اس قسم کی بحثیں تفسیر میں جگہ پاتی تھیں۔

۴- تالیف شدہ امالی کو مولانا نے دیکھ لیا تھا کہ ان کے ضبط و کتابت میں سامع نے کوتاہی نہیں کی، مولانا اس ذمہ داری کے معائنے کے بعد مطمئن ہوگئے تھے، اور اپنی مسرت کا اظہار کیا تھا (''امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی، حیات و خدمات، صفحہ ۲۶۵، ۲۶۶، مطبوعہ: دار الکتاب، اردو بازار، لاہور، اشاعتِ دوم: مئی 2016ء)

تفسیر الہامُ الرحمٰن کی تحقیق و تہذیب کی خدمت مولانا سندھی کے دوسرے دو معتبر شاگردوں شیخ محمد نور مرشد مکی اور مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی نے سر انجام دی ہے۔ شیخ مرشد محمد نور مکی، مکہ مکرمہ سے ہندوستان تک مولانا سندھی کے تلمیذ رہے۔ اور مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی بیرون ممالک سے واپسی کے بعد مولانا سندھی کے تلمیذ رہے ہیں، جو کہ مولانا سندھی کی طرف سے کراچی میں قائم کردہ بیت الحکمت کے جوائنٹ سیکرٹری اور بعد میں سیکرٹری مقرر ہوئے تھے

(ملاحظہ ہو: ''امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی، حیات و خدمات'' صفحہ ۳۵۹، وصفحہ ۴۷۶، ۴۷۷، مؤلف: ڈاکٹر ابو سلمان

شاہ جہان پوری، مطبوعہ: دارالکتاب، اردو بازار، لاہور، اشاعتِ دوم: مئی 2016ء)

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری صاحب لکھتے ہیں:

بیت الحکمت کی ایک شاخ مدرسہ دارالسعادت گوروپھوڑ میں قائم ہوئی تھی۔ گورو پھوڑ، تحصیل شکار پور (ضلع سکھر) کا ایک موضع ہے۔ یہ مدرسہ مولانا عبیداللہ سندھی کے شاگردوں اوران کے عقیدت مندوں نے قائم کیا تھا، اور مولانا سندھی مرحوم نے اس کا افتتاح کیا تھا۔ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی اس کے صدر مدرس اور مولوی عبیداللہ ولی اللٰہی لاڑکانوی اور مولوی عزیز اللہ جروار شہداد کوٹی اس کے طلبہ کے لیڈر تھے (''امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی، حیات وخدمات'' صفحہ ۳۶۰، مطبوعہ: دارالکتاب، اردو بازار، لاہور، اشاعتِ دوم: مئی 2016ء)

''تمدنِ عرب'' کے نام سے مولانا سندھی کے افکار پر مشتمل سورہ سبا کی تفسیر جو مولانا (غلام مصطفیٰ) قاسمی نے مرتب کی تھی، نواب نبی بخش بھٹو کی مالی اعانت سے بیت الحکمت کی شاخ گوٹھ پیر بخش بھٹو سے شائع ہوئی تھی (''امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی، حیات وخدمات'' صفحہ ۳۶۲، مطبوعہ: دارالکتاب، اردو بازار، لاہور، اشاعتِ دوم: مئی 2016ء)

مذکورہ عبارات وحوالہ جات کی روشنی میں ہم اس بات پر مجبور ہیں کہ ''تفسیر الہام الرحمٰن'' کو ظاہراً مولانا سندھی کے آخری دور کے افکار کی معتبر ترجمانی قرار دیں، اور اس تفسیر میں مذکور اختلافی اور قابلِ اعتراض امور کو بلادلیل یا کسی عصبیت وغیرہ کی بنیاد پر مولانا سندھی کے بجائے، ان کے تلامذہ کی طرف منسوب کرنے سے اجتناب کریں، جیسا کہ بعض حضرات کا دعویٰ ہے، کیونکہ یہ معاملہ دین کا ہے، جس میں بغیر معتبر دلیل کے کسی کی طرف نسبت کرنا خطرناک اور نازک معاملہ ہے، خواہ اس فرد کا تعلق کسی بھی طبقۂ فکر سے ہو۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ مذکورہ تفسیر اور اس کے املاء اور تحقیق وتہذیب کرنے والے تلامذہ، مولانا

سندھی کے بیرونِ ممالک چلے جانے کے بعد کے دور کے ہیں، اور اس دور کے افکار میں شذوذ موافقین ومخالفین کو مسلّم ہے، قطع نظر اس سے کہ اس کی وجہ مولانا سندھی کا اختلالِ ذہن کا ہونا ہو یا کچھ اور ہو۔

جہاں تک مولانا سندھی کے متعلق حسنِ ظن کا معاملہ ہے، تو ہماری طرف سے اس سلسلہ میں حسنِ ظن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، اور آگے بھی آتا ہے۔

کچھ اور تفسیری مواد کا ذکر

مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے حوالہ سے بعض شاذ افکار اور متنازع امور اِن کے دوسرے شاگردوں مثلاً شیخ بشیر احمد لدھیانوی اور غازی خدابخش کے مرتب یا املاء کردہ مواد کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔

شیخ بشیر احمد لدھیانوی، جنہوں نے ''قرآنی شعور انقلاب'' ''نظریۂ انقلاب'' ''شاہ ولی اللہ کا فلسفۂ عمرانیات'' وغیرہ کتابوں کو مرتب کیا ہے، ان کی تحریرات کو مولانا حافظ عبدالحق خان بشیر صاحب نے کافی حد تک محتاط اور معتدل قرار دیا ہے۔

شیخ بشیر احمد لدھیانوی کے ایک تفسیری مجموعہ کے بارے میں مولانا عبیداللہ سندھی صاحب خود تحریر فرماتے ہیں کہ:

> ہم 1939ء میں واپس وطن پہنچے، اس کے بعد جب کبھی لاہور آئے، اور اپنے عزیزوں کی خاطر وہاں رہے۔ مولوی بشیر احمد صاحب بی-اے لدھیانوی ہم سے قرآن شریف سمجھنے کے لیے مسلسل ملتے رہے۔ وہ ہمارے افکار لکھتے بھی رہتے تھے، اس طرح انہوں نے کئی سو صفحات تیار کر لیے۔ انہوں نے قرآن عظیم کا مطالعہ بہت عرصہ پہلے سے مختلف اساتذہ کی صحبت میں جاری رکھا تھا، اس لیے وہ ہمارے طرزِ تفکر کا انقلابی نقطہ تدریجاً سمجھنے کے قابل ہو گئے۔ اب ان کی خواہش ہے کہ ہمارا فکر لوگوں کو پڑھائیں، یا پریس کے ذریعہ سے پھیلائیں۔

ہمیں سندھ ساگر انسٹی ٹیوٹ کے متعلق علمی مرکز میں جس کا نام ''محمد قاسم ولی اللہ کالج آف تھیالوجی'' تجویز کیا ہے، ایسے ہی استاد کی ضرورت تھی۔ ہم نے انہیں اپنے ابتدائی تجارب میں شریک بنالیا ہے۔ انہوں نے اپنے افکار کا نمونہ سورہ مزمل اور سورہ مدثر کی تفسیر میں پیش کرنا پسند کیا ہے۔

ہماری تقریریں بہت سے دوستوں نے ضبط کرلی ہیں، مگر آج تک ہم نے کسی کی تصحیح اپنے ذمہ نہیں لی۔ مولوی بشیر احمد اور مولوی خدا بخش کی محنتوں کا ہم پر خاص اثر ہے، اس لیے ہم نے اس رسالہ پر نظرِ ثانی منظور کی ہے۔ ہم شہادت دیتے ہیں کہ ان افکار کی ذمہ داری میں ہم بھی ان کے ساتھ شریک ہیں۔ ہم اپنے دوستوں سے سفارش کرتے ہیں کہ وہ اپنی یادداشتیں اس طرزِ تفکر کے مطابق بنالیں۔

واللہ المستعان

عبیداللہ سندھی

(قرآنی شعور انقلاب، جمع وترتیب: شیخ بشیر احمد وغازی خدا بخش، ص ۳۱، بعنوان ''کلماتِ طیبات'' مطبوعہ: مکی دارالکتب، لاہور، اشاعتِ سوم: مارچ 1999ء)

شیخ بشیر احمد لدھیانوی کے مذکورہ تفسیری مجموعہ کی تصحیح کرنے کا اعتراف خود مولانا سندھی فرما رہے ہیں، اور ان میں مذکور افکار کی ذمہ داری میں اپنے آپ کو شریک قرار دے رہے ہیں، اور دوسرے دوستوں کو بھی ان کی یادداشتیں اس طرزِ فکر کے مطابق بنانے کی سفارش کررہے ہیں، اس تفسیری مجموعہ میں بھی محلِ نظر ومتنازع افکار پائے جاتے ہیں۔

شیخ بشیر احمد بی-اے، سورہ اخلاص ومعوذتین کی حکیمانہ انقلابی تفسیر کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ:

یہ اوراق مولانا عبیداللہ سندھی (نوراللہ مرقدہٗ) (1872ء۔1944ء) کے افکار سے ماخوذ ہیں، اور انہی کے مطالعے اور تجرباتِ زندگی کا نتیجہ ہیں۔

نیاز آگین

بشیر احمد بی-اے

سیکرٹری ولی اللہ سوسائٹی، پاکستان

(قرآنی شعور انقلاب، ص۲۶۲، ۲۶۳، ''دیباچہ'' قرآنی فکرِ انقلاب، سورہ اخلاص و معوذتین کی حکیمانہ انقلابی تفسیر، مرتب: شیخ بشیر احمد لدھیانوی، مطبوعہ: مکی دارالکتب، لاہور، اشاعتِ سوم: مارچ 1999ء)

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری صاحب لکھتے ہیں:

شیخ بشیر احمد بی-اے لدھیانوی نے جن سورتوں کی تفسیر مرتب فرمائی ہے۔وہ انہوں نے خود حضرت مولانا سندھی سے پڑھ کر اور سمجھ کر مرتب فرمائی ہے، موصوف کی مرتبہ بعض سورتوں کی تفسیر مولانا مرحوم کی نظر سے بھی گزری تھی، اور انہوں نے اسے پسند فرمایا تھا، اور ایک سند بھی انہیں لکھ دی تھی، جو لدھیانوی صاحب نے ''دستورِ انقلاب'' کے شروع میں ''کلماتِ طیبات'' کے عنوان سے شامل کردی ہے (''امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی، حیات وخدمات، صفحہ۲۶۳، مطبوعہ: دارالکتاب، اردو بازار، لاہور، اشاعتِ دوم: مئی 2016ء)

اور مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے آخری دور کے ایک اور خاص شاگرد اور شیخ بشیر احمد لدھیانوی کے ہم عصر وہم سبق ساتھی جناب غازی خدا بخش لکھتے ہیں:

شیخ التفسیر حضرت لاہوری سے امامِ انقلاب سندھی نے ان کے شاگردوں میں سے دو نوجوان طلب کیے۔حضرت لاہوری نے اپنے دو شاگردان کے حوالے کیے، ایک تھے شیخ بشیر احمد بی-اے، اور دوسرا راقم آثم خدا بخش عفی عنہ، جو کچھ عرصہ کے لیے کابل، مکہ معظّمہ اور سندھ کے گوٹھ ''پیر جھنڈا'' میں حضرت سندھی کی رفاقت میں رہا۔حضرت سندھی نے وصال سے پہلے چار ہزار صفحات مختلف امالیوں میں قرآن وحدیث، سیاست اور تصوف وغیرہ کے موضوعات پر لکھوا

دیئے۔ انہیں امالیوں میں سے ایک املی کی ایک سورت قارئین کے غور وفکر کے لیے تحریر کی جاتی ہے۔

غازی خدا بخش

(قرآنی شعور انقلاب، ص۱۶۴، بعنوان ''عرضِ مرتب'' قرآنی حزبِ اختلاف، سورۃ المجادلہ کی حکیمانہ انقلابی تفسیر، مرتب: غازی خدا بخش و شیخ بشیر احمد لدھیانوی، مطبوعہ: مکی دارالکتب، لاہور، اشاعتِ سوم: مارچ 1999ء)

مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ شیخ بشیر احمد لدھیانوی اور غازی خدا بخش ابتداء میں مولانا لاہوری کے تلامذہ تھے، جن کو مولانا سندھی نے ان سے اپنے لیے طلب کیا تھا، اور شیخ بشیر احمد لدھیانوی کے علاوہ غازی خدا بخش صاحب کو مولانا سندھی نے چار ہزار صفحات مختلف املی کی شکل میں لکھوائے تھے، جن میں کچھ تفسیری املی بھی شامل تھے۔

غازی خدا بخش، لاہور اور شیخ بشیر احمد لدھیانوی لاہور کا شمار مولانا سندھی کے ترکِ وطن کے بعد کے تلامذہ میں ہوتا ہے (ملاحظہ ہو: ''امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی، حیات وخدمات'' صفحہ ۴۷۷، مؤلف: ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری، مطبوعہ: دار الکتاب، اردو بازار، لاہور، اشاعتِ دوم: مئی 2016ء)

مذکورہ دونوں حضرات، چونکہ ابتداء میں مولانا احمد علی لاہوری صاحب کے شاگرد تھے، بعد میں مولانا سندھی کی خواہش پر انہوں نے مولانا سندھی کے تلمیذ ہونے کا مقام حاصل کیا، اس لیے یہ دونوں حضرات بعض اہلِ علم کے بقول مولانا لاہوری کے ساتھ ساتھ مولانا سندھی کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد کے معتمد شاگردوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ جس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری صاحب لکھتے ہیں:

> مولانا سندھی مرحوم کا ارادہ تھا کہ بیت الحکمت کی شاخیں ملک کے ہر حصے میں قائم کی جائیں، لیکن جو شاخیں قائم ہوئیں، وہ سندھ اور پنجاب میں قائم ہوئیں۔ دارالحکومت دہلی کے بعد سندھ اور پنجاب مولانا سندھی کی علمی وسیاسی سرگرمیوں

کے سب سے بڑے میدان تھے۔ یوں تو اپنی اپنی جگہ بیت الحکمت کی تمام شاخوں نے شاہ ولی اللہ کے علوم ومعارف اور افکار وخیالات کی اشاعت میں حصہ لیا، خصوصاً سندھ میں ایک مستقل مکتبِ فکر کی بنیاد پڑی، لیکن تصنیف وتالیف کا میدان شروع ہی سے پنجاب کے ہاتھ میں رہا۔ سب سے زیادہ کتابیں بیت الحکمت لاہور سے شائع ہوئیں۔ یہ شاخ مولانا احمد علی لاہوری کے شاگردوں نے قائم کی تھی۔ اس کے صدر مولوی خدا بخش اور سیکریٹری بشیر احمد لدھیانوی تھے۔ ان دونوں حضرات نے مولانا سندھی سے استفادہ کیا تھا۔ دونوں صاحبوں نے شاہ ولی اللہ اور ان کے سب سے بڑے شارح وترجمان مولانا عبیداللہ (سندھی) کے افکار کی ترتیب واشاعت میں سرگرمی سے حصہ لیا، اور ان کی کوششوں کی بدولت اردو کے قرآنی تفسیری لٹریچر میں انقلابی اور وقت کے فکری، سیاسی اور معاشی مباحث پر فکر انگیز اور گراں قدر اضافہ ہوا۔ عنوانِ انقلاب (تفسیر سورہ فتح) اصولِ انقلاب (تفسیر سورہ عصر) جنگِ انقلاب (تفسیر سورہ محمد)، امام ولی اللہ دہلوی اور ان کا فلسفۂ عمرانیات، شرح حجۃ اللہ البالغۃ، رسالہ محمودیہ، وغیرہ تصانیف میری نظر سے گزر چکی ہیں (''امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی، حیات وخدمات'' صفحہ ۳۵۸، ۳۵۹، مطبوعہ: دار الکتاب، اردو بازار، لاہور، اشاعتِ دوم: مئی 2016ء)

بہر حال جناب غازی خدا بخش اور شیخ بشیر احمد لدھیانوی صاحبان کا شمار مولانا احمد علی لاہوری صاحب اور مولانا سندھی صاحب کے تلامذہ میں ہوتا ہے، جن پر مولانا سندھی کو خاص اعتماد تھا، اور انہوں نے ان حضرات کو اپنی زندگی میں بعض علمی وتبلیغی سرگرمیوں کی ذمہ داریاں بھی سپرد کی تھیں، اور مولانا سندھی کے متعدد تفسیری مواد اور تقریرات کا ان حضراتِ گرامی نے املاء بھی کیا تھا، اور ان کے املاء پر مولانا سندھی نے خود تحریری طور پر اعتماد کا اظہار بھی کیا تھا۔ لہٰذا ان حضرات کی املائی تحریرات کے بارے میں یہ حکم لگانا کہ مولانا سندھی کے افکار نقل

کرنے میں انہوں نے خیانت یا خرد برد سے کام لیا ہے، یا وہ مولانا سندھی کے معتبر و معتمد تلامذہ کرام کی فہرست سے خارج ہیں، یہ "تاویل القول بما لایرضی به القائل" کے قبیل سے کم حیثیت نہیں رکھے گا۔

ملحوظ رہے کہ مولانا سندھی 1915ء میں ہندوستان سے چلے گئے، اور کابل، روس، ترکی اور حجاز سے ہوتے ہوئے 1939ء میں واپس ہندوستان تشریف لائے۔اس طرح مولانا سندھی کے بیرون ملک قیام کا یہ زمانہ 24 سال کے طویل عرصہ پر محیط ہے۔اس زمانہ میں مولانا سندھی اکابر دیوبند سے دور اور غیر جنس صحبتوں میں قیام پذیر رہے۔اس طویل عرصہ میں آپ کے متعدد تلامذہ نے آپ کی تقریروں کو قلمبند کیا، اور 1939ء میں جب مولانا سندھی، ہندوستان واپس تشریف لائے، اور عرصہ پانچ سال تک شاذ افکار کا مختلف مواقع پر اظہار کیا، تو علماء کی طرف سے ان کی تردید کی گئی۔

مذکورہ تمام تر تفصیل کے باوجود بعض حضرات مولانا سندھی کے معتمد املاء کرنے والوں کی تحریرات کے معتبر و معتمد ہونے میں بلا دلیل بلکہ خلافِ دلیل تشکیک پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

غور طلب بات یہ ہے کہ اپنے جن متعدد تلامذہ و رفقاء پر یا ان کی تحریرات و املائی تقریروں پر خود مولانا سندھی اعتماد فرمارہے ہوں، ان کو اپنے مشن کی ذمہ داریاں اور عہدے سپرد فرمارہے ہوں، اور ان میں اہلِ علم و علماء بھی داخل ہوں، ان کے کام کے بارے میں کسی شخص کی طرف سے تشکیک پیدا کرنا یا اس سے بڑھ کر غیر معتمد و غیر ذمہ دار و غلط بیانی وغیرہ کے مرتکب یا دوسروں کی دسیسہ کاری اور حدیثِ دیگراں وغیرہ کا حکم لگانا یا مولانا سندھی کے تمام معتبر شاگردوں کی طرف سے تردید کا دعویٰ کرنا کیا معنیٰ وحیثیت رکھتا ہے؟

اگر اس طرح کے کسی کے املاء کو معتبر نہ مانا جائے، تو خود امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مسلک وفقہ کا بڑا حصہ ان کے تلامذہ کے ذریعہ سے املاء کی شکل میں منتقل ہوا ہے۔اسی طرح امالی ابو یوسف

(امام ابو یوسف) کا علمی مقام ہمیشہ معروف رہا ہے، اور بھی بے شمار اصحابِ علم کا یہی معاملہ ہے۔ اگر بلا دلیل املاء کو مطلقاً غلط قرار دیئے جانے کی روایت چل پڑے، تو اس سے تو نقل اور دین بلکہ تاریخ کا بڑا حصہ غیر معتبر ٹھہرے گا۔ پھر یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ املاء کرنے میں تھوڑے بہت الفاظ کا اتار چڑھاؤ ایک الگ چیز ہے (ایسا تو حدیث تک میں راویت بالمعنیٰ کے تحت گوارا کیا گیا، بلکہ حدیث کا بڑا حصہ روایت بالمعنیٰ پر مشتمل ہے) جیسا کہ کتبِ اصولِ حدیث میں مفصل بحث موجود ہے۔

لیکن ایک پورے اور مکمل عقیدہ کو صراحت اور وضاحت کے ساتھ نقل کرنے اور اس پر دلائل قائم کرنے میں کسی کی طرف املاء کی غلطی کو منسوب کرنا بالکل الگ چیز ہے۔ ہم کم از کم یہ توقع نہیں کرتے کہ مولانا سندھی کے متعدد و معتمد شاگردوں نے جو الگ الگ اور اپنے اپنے طور پر املاء کیا، اور ان پر خود استاذ ہونے کی حیثیت سے مولانا سندھی نے بھی صاد کیا، اور اعتماد کا اظہار کیا، اور دیگر تلامذہ نے بھی اعتماد کی شہادت دی، اور خارجی معتبر ذرائع سے بھی مولانا سندھی کے افکار کے شاذ ہونے کی تسلسل کے ساتھ تائید ہو رہی ہو، ان سب چیزوں کو نظر انداز کر کے املاء میں ایسی صریح غلطیوں کا حکم لگایا جائے، جو اتہام اور صریح کذب میں داخل ہوتی ہیں، یہ کس طرح عدل و انصاف پر مبنی کہلایا جا سکتا ہے؟ مولانا کی ذات سے عقیدت اور اِن کو معصوم ثابت کرنے کے لیے یا بچانے کے لیے ان کے شاگردوں کو قابلِ گردن زدنی قرار دینا اور مسلمہ اسلامی عقائد اور تعلیمات کے خلاف ساری باتیں ان کے کھاتے میں ڈال کر دوسرا جرم ان کا یہ بتانا کہ انہوں نے دروغ گوئی کرتے ہوئے یہ باتیں مولانا کی طرف منسوب کیں، گویا مولانا پر تہمت باندھی، یہ کہاں کا انصاف ہے؟

جناب ماہر القادری صاحب نے اس موقع پر بڑی عمدہ بات کہی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''مولانا سندھی کے افکار کیا تھے؟ اس پر ہماری تنقید آگے آ رہی ہے، مگر اُن کی نیک نیتی اور اخلاص میں شک نہیں کیا جا سکتا۔ ملتِ اسلامیہ کے وہ خیر خواہ تھے،

اور دنیا میں اسلام کا غلبہ چاہتے تھے۔لیکن اخلاص و نیک نیتی اور اصابت رائے لازم وملزوم نہیں ہیں، خلوص اور نیک نیتی کے باوجود انسان سے فکر وعمل کی غلطی اور لغزشیں بھی ہوسکتی ہیں، اور ہوتی رہی ہیں‘‘

(جناب ماہرالقادری صاحب کا یہ مضمون آگے ماہنامہ ’’فاران‘‘ کے حوالہ سے آتا ہے)

مولانا سندھی کے افکار میں تضاد وتصادم کا مسئلہ

(5)...... جہاں تک مولانا سندھی کی طرف نسبت کردہ کلام اور افکار ونظریات میں خوفناک نوعیت کے تضاد وتصادم کا تعلق ہے، تو ان کے کلام میں تناقض یا تضاد وغیرہ سے یہ لازم نہیں آتا کہ صرف متضاد ومتناقض ہونے کی بنیاد پر مولانا سندھی کی طرف ان شاذ افکار کی نسبت کا انکار ہی کردیا جائے، جو معتبر طریقہ پر ان کی طرف منسوب ہیں۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی صاحب رحمہ اللہ مولانا سندھی کے بارے میں ان کے آخری زمانہ کا اپنا مشاہدہ ان الفاظ میں بیان فرما چکے ہیں:

’’بسا اوقات ایک ہی مجلس میں متضاد اور متخالف اُمور فرماتے رہتے ہیں۔

ہندوستان تشریف لانے کے بعد بھی ان کے احوالِ متضادیہ میں کمی نہیں ہوئی، بلکہ کچھ اضافہ ہی رہا، جس کی بناء پر ہم کو یقین ہوگیا کہ مولانا کے دماغی توازن پر کاری اثر پڑا ہے...... یہ دماغی انقلاب نہ صرف مولانا کی سیاسیات ہی تک محدود رہا، بلکہ علمی اور مذہبی تقاریر اور تحریرات تک بھی متجاوز ہوا‘‘

(مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرِ ولیُ اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ، صفحہ ۹۷، ۹۸)

معلوم ہوا کہ مکہ مکرمہ میں قیام کے زمانہ میں مولانا سندھی ایک ہی مجلس میں متضاد اور متخالف امور وافکار بیان کرتے تھے، جس کے بعد ہندوستان پہنچ کر اس قسم کے احوالِ متضادہ میں اضافہ ہوگیا، لہٰذا اگر مولانا سندھی کے آخری دور کی تحریرات اور املاء شدہ تقریرات میں بھی

تضاد نظر آئے، تو اس کی وجہ سے مولانا سندھی کی طرف نسبت کے انکار کی صحت کے کیا معنیٰ؟

مولانا مناظر احسن گیلانی صاحب اپنے مضمون میں فرماتے ہیں:

''سندھی صاحب کے کلام میں ہر قسم کی باتیں پائی جاتی ہیں۔ کوئی چاہے تو جو کچھ میں نے نکال کر دکھایا ہے، بالکل اس کے مخالف خیالات بھی اسی کتاب سے انتخاب کر سکتا ہے۔......

میرے بیان کی تردید کے لئے ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ میں نے جن حوالوں کو درج کیا ہے، ان کے متعلق ثابت کر دیا جائے کہ ''مولانا عبید اللہ سندھی'' نامی کتاب یا ماہنامہ الفرقان کے شاہ ولی اللہ نمبر میں شامل سندھی صاحب کے مقالے میں نہیں ہیں۔ لیکن یہ ترکیب کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے، اس کے متناقض بیانات نقل کر دیئے جائیں، یہ قطعاً کافی نہیں''

(مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ، صفحہ ۱۵۴، ۱۵۵)

اور مولانا ریاست علی ندوی صاحب لکھتے ہیں:

''مولانا کے افکار کا جائزہ لینے کے لیے مستقل تصانیف کی ضرورت ہے۔ وہ ایک ہی سانس میں متضاد باتیں کہہ جانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ایک ہی بات کو جداگانہ زاویۂ نگاہ سے پیش کرتے ہیں، اور ایک دوسرے سے متضاد نتائج نکالتے ہیں'' (مولانا ریاست علی ندوی صاحب کا یہ مضمون آگے ماہنامہ ''معارف'' کے حوالہ سے آتا ہے)

مولانا موصوف کی طرف سے مزید وضاحت آگے صفحہ 153 پر آتی ہے۔

اور حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب زید مجدہٗ فرماتے ہیں:

جس شخصیت کے بارے میں یہ بات مسلّم ہو کہ اس کے کچھ افکار شاذ ہیں، اس کے دفاع میں صرف اس کی صحیح باتوں کو نقل کرنا مفید نہیں ہوتا، بلکہ ان افکارِ شاذّہ کی حقیقت واضح کرنی ضروری ہوتی ہے'' (مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی

کے نظریات کا تحقیقی جائزہ، ص۲۸۰)

معلوم ہوا کہ کسی ایک کتاب میں غلط باتوں کا موجود ہونا تغلیط کے لیے کافی ہوتا ہے، اور اس کتاب میں اس کے مخالف باتوں کے پیش کرنے سے تغلیط ختم نہیں ہوتی۔

لہٰذا اولاً تو اگر مولانا سندھی سے منسوب بعض تحریرات میں کچھ درست باتیں ہوں، اور دوسری بعض تحریرات میں کچھ غلط باتیں ہوں، تو ان کو زمانی فرق پر محمول کیا جاسکتا ہے۔

ثانیاً اگر درست اور غلط باتیں ایک ہی زمانہ کی ہوں، تو انہیں بقول حضرت مدنی، مولانا سندھی کے دماغی انقلاب واختلال پر محمول کیا جاسکتا ہے، اور ایسی صورت میں بھی غلط باتوں کی تردید کی ضرورت اپنی جگہ برقرار رہتی ہے، جس کا مشورہ حضرت مدنی رحمہ اللہ خود اپنی تحریر میں دے چکے ہیں۔

ثالثاً بعض اوقات تضادات کا مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ جب کسی غلط بات پر مؤاخذہ ہو، تو دوسری بات سامنے لاکر اس سے بچا جاسکے، اور مولانا سندھی کے حوالہ سے بعض افراد کی طرف سے اسی نوعیت کا طرزِ عمل آج تک سامنے آرہا ہے۔

چنانچہ مولانا عمر فاروق صاحب (استاذ، جامعۃ الرشید، کراچی) نے اپنی کتاب ''تنظیمِ فکرِ ولی اللّٰہی کیا ہے؟'' مطبوعہ: مکتبہ نقشبندیہ، طارق روڈ، کراچی، کے صفحہ 534 میں ''تضاداتِ فکریت'' کا عنوان قائم کر کے مولانا سندھی کی طرف منسوب کتب ومضامین سے متعدد تضادات نقل کیے ہیں، اور اس کے بعد صفحہ 706 پر یہ عنوان قائم کیا ہے کہ ''تضادات، اپنے آپ کو بچانے کا ایک گُر''، جس کے ضمن میں مولانا سندھی کے افادات وملفوظات کا ایک اقتباس نقل کیا ہے۔

ذیل میں افادات وملفوظات کا وہ مضمون نقل کیا جاتا ہے، جس کا عنوان ہے ''عدمِ ترتیب وانتشارِ فکری کا الزام اور اس کا جواب''

15 فروری 1944ء کو رات کے کھانے پر دورانِ گفتگو، میں (محمد سرور) نے

مولانا (سندھی) سے بہت بچا کے اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے ان اعتراضات کا ذکر کرنا چاہا، جو لوگ ان کے افکار و خیالات پر کرتے ہیں۔ مولانا بھڑک اٹھے، اور جیسا کہ ایسے موقعوں پر اکثر ہوتا تھا، وہ زور زور سے بولنے لگے۔ میں ایک بات کہتا، وہ برس پڑتے، اور میں چپ ہو جاتا۔ پھر کچھ اور عرض کرتا، وہ زیادہ سختی سے ڈانٹنے لگتے، اور میں خاموش ہو جاتا۔ غرض اس طرح جب وہ اپنا غصہ نکال چکے اور ان کی طبیعت میں قدرے سکون آ گیا، تو فرمانے لگے کہ میں شاہ ولی اللہ صاحب کی سیاسی تحریک کے جس تیسرے دور کی دعوت دیتا ہوں، واقعی اس کے بارے میں مزید کچھ لکھنے کی ضرورت ہے۔ اور اب میں یہ کام کروں گا۔

یہ رات کی گفتگو تھی، دوسری صبح کو چائے پر مولانا (سندھی) فرمانے لگے کہ ایک نظام کے اندر رہ کر اگر کوئی انقلاب کرنا ہے، تو ضروری ہوتا ہے کہ اپنے مقاصد کو ابتداء ہی سے اس طرح واشگاف نہ کیا جائے کہ پہلے دن ہی سے مخالفت شروع ہو جائے۔

میں تمہیں بتا دوں کہ میں اپنا ایک منظّم فکر اور مفصل پروگرام رکھتا ہوں، اور میں نے سالہا سال غور و فکر کر کے اس کی تفصیلات مرتب کی ہیں۔ جب میں ہندوستان واپس آیا، تو مجھ سے میرے ساتھی میرا پروگرام پوچھنے لگے۔ اب اگر میں ان سے اپنی ساری باتیں کہہ دیتا، تو مجھے یقین ہے کہ وہ انہیں سرے سے ناقابلِ عمل سمجھ کر مجھے ہمت دلانے کے بجائے ناامید کر دیتے۔ میں نے یہ کیا کہ جب بھی مجھے موقع ملا، حاضرین کی سمجھ بوجھ کے مطابق ان کو کوئی جزوی بات کہہ دی۔ لوگوں نے غلطی سے یہ سمجھا کہ میرے فکر اور جو میں سیاسی طریقۂ کار پیش کرتا ہوں، ان میں کوئی ترتیب نہیں، اور میں ذہنی تضاد و انتشار کا شکار ہوں۔

ہمارے جو بزرگ پہلے گزر چکے ہیں، ان کے افکار و خیالات کے بارے میں بھی اسی طرح عدمِ ترتیب و انتشار کی شکایت ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ان کا شخصی

اور استبدادی حکومتوں کا زمانہ تھا، اور ہر صاحبِ فکر کو آزادی سے بات کہنے پر ہمیشہ جان کا خطرہ رہتا۔ مخالفین کی کہاں کمی ہوتی ہے۔ ذرا سی بات ہوئی اور حکمران کے کان بھر دیئے۔ ان غایت درجہ خطرناک حالات میں اہلِ فکر اپنے خیالات کو اس طرح قلمبند کرتے کہ ان میں بظاہر ترتیب نہ ہوتی۔ ایک جگہ ایک بات کہتے، اور دوسری جگہ اس سے الٹ بات کہہ جاتے، تاکہ اگر ایک بات پر گرفت ہو، تو دوسری بات سے صفائی ہو جائے (افادات وملفوظات، صفحہ ۳۹۷، ۳۹۸، بعنوان ''ملفوظات'' مطبوعہ: سندھ ساگر اکادمی، لاہور، تاریخِ اشاعت: 2014ء)

بہرحال مذکورہ بحث سے قطع نظر مولانا سندھی کے کلام میں تناقض وتصادم کی وجہ سے یہ حکم لگانا کہ ان کی طرف منسوب مواد میں جو بات درست ہوگی، وہ تو ان کا اپنا کلام شمار ہوگی، اور جو بات غلط ہوگی، وہ ان کے شاگردوں کی کارستانی یا نقل واملاء کی غلطی وغیرہ ہوگی۔ ہمارے نزدیک حقائق کی رُو سے اس دعوے میں وزن معلوم نہیں ہوتا۔

دوسری طرف مولانا سندھی کی حمایت کرتے ہوئے ان کے متعدد شاگردوں پر بلا دلیل اس طرح کا الزام عائد کرنا، ایک ایسا دعویٰ ہے کہ جس کا معاملہ دنیا تک محدود نہیں، بلکہ اس کا اصل تعلق آخرت سے ہے، جس کی دلیل نہ ہونے اور خلافِ دلیل ہونے کی صورت میں اس دعوے پر آخرت میں بھی سوال ومؤاخذہ کا اندیشہ ہے۔

مذکورہ تفصیل کے پیشِ نظر خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مولانا سندھی کے کسی کلام میں اگر کوئی غلط فکر ذکر کی گئی ہو، تو اس کی وجہ سے دوسرے کلام میں درست فکر کی وجہ سے نسبت کی تردید کرنا درست معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ اگر کوئی شخص ایک موقع پر غلط بات کرے، تو اس کو بہرحال غلط کہا جاتا ہے، بے شک اس نے دوسرے کسی موقع پر درست بات کیوں نہ کی ہو۔

اور ان کے مضامین وتحریرات سے کچھ صحیح باتوں کو پیش کرکے دفاع کرنا اور غلط باتوں کی نسبت کا انکار یا بے جا تاویل کرنا، یہ اسی طرح کی شکایت ہے، جس کا قرآن مجید میں ان

الفاظ کے ساتھ ذکر ہے:

"أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ"

اور ہم یہ پہلے ہی عرض کر چکے ہیں کہ اصل مقصود مولانا سندھی کے حوالہ ونسبت سے شائع غلط دینی افکار ونظریات کی تردید ہے، خواہ یہ افکار مولانا سندھی سے اختلالِ عقل کی حالت میں صادر ہوئے ہوں، یا کسی اور حالت میں صادر ہوئے ہوں، اس کا معاملہ اللہ کے حوالہ کرنا اور آخرت پر چھوڑنا چاہئے۔ اور حسنِ ظن کا تقاضا یہ ہے کہ جو افکار اجتہادی صواب وخطاء کا احتمال رکھنے سے زیادہ غیر مجتہد فیہ ہونے کی حیثیت سے تغلیط وتردید کے متقاضی ہوں، انہیں بقول حضرت مدنی قدس سرہٗ، مولانا سندھی کے ذہنی اختلال پر محمول کیا جائے، اور جو افکار اجتہادی خطاء وصواب کا احتمال رکھتے ہوں، ان میں دلائل کے پیشِ نظر مخالف کو اپنی رائے صواب پر اور مولانا سندھی کی رائے خطاء پر مبنی قرار دینے کا بھی حق ہے، لیکن بہر صورت مولانا سندھی کی استخلاصِ وطن کے لیے خدمات کے اعتراف کا معاملہ اپنی جگہ برقرار ہے۔

ہم مولانا سندھی صاحب کے بارے میں اس سے زیادہ حسنِ ظن کو کسی معتبر دلیل پر مبنی نہیں سمجھتے، اور جہاں تک ان کی طرف شاذ افکار کی نسبت کی تغلیط کا تعلق ہے، تو اس سے اتفاق اس لیے مشکل ہے کہ حضرت سندھی کے معاصر اور بعد کے متعدد اصحابِ علم اور خود مولانا سندھی کے متعدد معتبر تلامذہ اس کو تسلیم وقبول کر چکے ہیں۔ اس کے بجائے اپنی طرف سے مولانا سندھی کے آخرت کے درجات کی تعیین کے معاملہ کو طے کرنے میں مشغول ہو جانا، یہ ہمارے بس سے باہر کی چیز ہے، جس کا بوجھ اٹھانے کی ہم اپنے کندھوں میں سکت نہیں پاتے، اور اس موقع پر اللہ تعالیٰ کے اس کلام کو مستحضر کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں۔

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ .

اور اگر یہ معاملہ صرف ذات کا ہوتا، یا مولانا سندھی کے افکار کی اشاعت وتبلیغ نہ کی جاتی، اور ان کا اثر دوسروں پر مرتب نہ ہوتا، تو ہم مولانا سندھی کے افکار پر تفصیلاً مذکورہ گفتگو کی بھی ضرورت نہ سمجھتے۔ جیسا کہ مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے مولانا سندھی کے متعلق درجِ ذیل کلمات تحریر فرمائے کہ:

''یہ معاملہ اگر ذات کا ہوتا تو یہ تحریر یہیں ختم ہو جاتی، مگر افسوس کہ یہ ذات کا نہیں بلکہ دین کا ہے، پھر گو وہ خود اس دنیائے دَنی سے رخصت ہو گئے، مگر اپنے خیالات کو اپنے دوستوں کی تحریروں کے ذریعہ سے خلعتِ دوام بخش گئے ہیں، اس لئے جب تک وہ موجود ہیں، وہ زیرِ بحث آتے ہی رہیں گے'' (مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ، صفحہ ۲۱۹)

''ممکن تھا کہ مولانا کی وفات پر ان کے خیالات کی بھی وفات ہو جاتی، مگر افسوس پر افسوس یہ ہے کہ ان کے افکار وخیالات کی ترتیب وتہذیب واشاعت کا فرض ایک خاص ادارہ (سندھ ساگر اکیڈمی) کی طرف سے سرانجام پایا ہے، جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ان خیالات نے اپنے بانی کی زندگی کے بعد بھی اپنی زندگی کا سامان کرلیا ہے۔ ملک میں یہ خیالات برملا ظاہر کئے گئے، اور ان کی دعوت پر دعوت دی گئی، بلکہ اس کی ترتیب واشاعت میں بعض علماء نے بھی حصہ لیا'' (ایضاً، صفحہ ۲۲۹)

مندرجہ بالا وجوہات کی بناء پر ہمیں بعض اہلِ علم کے اس موقف سے قطعی اتفاق نہیں ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ کی فکر کے صحیح ترجمان اور شارح ہیں۔

تنظیمِ فکرِ ولی اللّٰہی کے متعلق تبصرہ پر گفتگو

(6)...... فاضل مبصر نے اپنی قائم کردہ تقسیم کے مطابق تیسری رائے کے حاملین پر جن میں

انہوں نے تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کے افراد کو شامل کیا ہے، کوئی خاطر خواہ تنقید نہیں کی، البتہ اپنے تبصرے میں تنظیم کے تین علماء کی تحریروں کے اقتباسات نقل کیے ہیں۔ یہ تحریریں تنظیم کے دفاع میں ہیں۔

فاضل مبصر لکھتے ہیں:

> ''تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی خانقاہ رائے پور کے چوتھے صدر نشین مولانا سعید احمد رائے پوری نے ملتان میں 1987ء میں قائم کی''

لیکن مولانا سعید احمد رائے پوری صاحب کو رائے پور کا چوتھا صدر نشین ہونے سے متعدد حضرات کو اختلاف ہے، تفصیل کے لیے مولانا ڈاکٹر عبدالحکیم اکبری کی تالیف ''تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی اور اس کی قیادت حقیقت کے آئینہ میں'' صفحہ 20 پر ''خانقاہ عالیہ رائے پوری کے جانشین کون؟'' ملاحظہ فرمائیں۔

تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کے بارے میں اربابِ دارالافتاء کی طرف سے جاری کیے گئے فتاویٰ کا حوالہ دیتے ہوئے فاضل مبصر ارشاد فرماتے ہیں:

> ان فتاویٰ کے معروضی اور عادلانہ جائزے کا تقاضا یہ ہے کہ خود تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کے لٹریچر کی طرف رجوع کیا جائے کہ وہ حضرات ان باتوں کے جواب میں کیا کہتے ہیں؟......
>
> مذکورہ بالا فتاویٰ کے منظرِ عام پر آنے کے بعد تنظیم کے تین علماء مفتی عبدالمتین نعمانی، مفتی عبدالقدیر اور مفتی عبدالغنی قاسمی نے ان فتاویٰ کا جائزہ لیا، اور ایک کتاب اپریل 2006ء میں ''تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کی بابت فتووں کی حقیقت'' کے نام سے شائع کی۔ دیانت کا تقاضا ہے کہ ان فتاویٰ پر ان تصریحات کو پیشِ نظر رکھا جائے۔

اس کے بعد فاضل مبصر تنظیم کے مذکورہ تین علماء کی طرف سے تحریر کردہ کتاب کے بارے میں

لکھتے ہیں:

اس کتاب میں ایک کمی بہرحال نظر آتی ہے کہ فتووں میں مولانا سندھی کی جو محلِ نظر عبارات پیش کی گئی ہیں، ان کی توجیہ کے لیے کتاب عام طور پر خاموش ہے۔ لیکن بہرحال تنظیم کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کرنے سے پہلے نہایت ضروری ہے کہ ان تفصیلات کو پیشِ نظر رکھا جائے۔

(ماہنامہ ''الشریعۃ'' گوجرانوالہ، ستمبر 2016، صفحہ نمبر ۴۷، ۴۸)

آخر میں فاضل مبصر فرماتے ہیں:

مولانا سندھی کے بارے میں تنظیم فکرِ ولی اللٰہی کے افراد کے لیے بھی مناسب طرز یہی ہے کہ مولانا سندھی کے جو افکار شاذ ہیں، اور امت کے اجماعی تعامل کے منافی ہیں، ان کے بے جا دفاع کرنے سے گریز کریں۔

(ماہنامہ ''الشریعۃ'' گوجرانوالہ، ستمبر 2016، صفحہ نمبر ۴۹)

لیکن اولاً تو غور طلب بات یہ ہے کہ جب تنظیم کے مذکورہ تین علماء کی طرف سے لکھی گئی کتاب، مولانا سندھی کی محلِ نظر عبارات کے بارے میں خاموش ہے، تو کیا اس خاموشی کی صورت میں ان کی طرف سے کوئی تاویل معتبر ہوسکتی ہے، جبکہ فتاویٰ میں ان عبارات کو بنیاد بنایا گیا ہے، اور جن کتب ورسائل سے یہ عبارات ماخوذ ہیں، وہ کتب ورسائل نہ صرف یہ کہ تنظیم کے لٹریچر کا حصہ ہیں، بلکہ تنظیم کی اصل بنیاد مولانا سندھی کے لٹریچر پر ہی ہے، تفسیر ''المقام المحمود'' پر تقاریظ لکھنے والوں میں خود تنظیم کے موجودہ سرپرست مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری، موجودہ صدر مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اور تنظیم کے ایک عالم مولانا مفتی عبدالقدیر شامل ہیں۔

ثانیاً فاضل مبصر خود بھی تنظیم کے افراد کو مولانا سندھی کے افکارِ شاذہ کے بے جا دفاع سے گریز کرنے کا مشورہ دیتے ہیں، تو اگر فاضل مبصر خود ہی ان شاذ افکار کی نشاندہی فرما دیتے، تو ان

فتووں کی حقیقت اور درجہ کو طے کرنے کا کام آسان ہو جاتا۔

ثالثاً مولانا حافظ عبدالحق خان بشیر صاحب نے اپنی کتاب ”مولانا عبیداللہ سندھی اور تنظیم فکر ولی اللّٰہی“ کے باب ثالث ”تنظیم فکر ولی اللّٰہی اپنی جدوجہد کے آئینہ میں“ اور اس کے بعد باب رابع ”فکری تحریک کے افکارِ فاسدہ“ میں مذکور تنظیم کی کتب اور لٹریچر سے باحوالہ اقتباسات نقل کر کے ان کو گمراہ کن قرار دیا ہے، بلکہ مذکورہ کتاب کا بنیادی مقصود بھی ”تنظیم فکر ولی اللّٰہی“ کے غلط افکار و نظریات کی تردید ہے۔

چنانچہ مولانا حافظ عبدالحق خان بشیر صاحب اپنی اس کتاب کے شروع میں ہی ”آغازِ سخن“ کی سرخی کے ذیل میں فرماتے ہیں:

> گزشتہ کئی سال سے بعض جماعتی و مسلکی احباب کی طرف سے شدید تقاضا تھا کہ ”تنظیم فکر ولی اللّٰہی“ کے بارہ میں ایک تحقیقی و معلوماتی مقالہ تحریر کیا جائے، جس سے اس کی نظریاتی و فکری پوزیشن واضح ہو سکے (مولانا عبیداللہ سندھی اور تنظیم فکر ولی اللّٰہی، ص۱۲، مطبوعہ: حق چار یار اکیڈمی، مدرسہ حیاتُ النبی، گجرات، طبع اول: محرم 1425ھ، مارچ 2004ء)

اور اس کتاب کا اپنے تبصرہ میں فاضل مبصر نے بھی حوالہ دیا ہے، بلکہ فاضل مبصر نے اپنے تبصرہ میں اس کے کچھ اقتباسات بھی نقل کیے ہیں۔

مگر شاید فاضل مبصر کی اس کتاب کے اصل مقصود، اور ان ابواب یا کتاب کی ان ابحاث کی طرف توجہ نہیں ہو سکی، ورنہ مذکورہ تنظیم کے افکارِ فاسدہ اور ان پر جاری فتاویٰ پر مذکورہ تحفظات کے اظہار کی ضرورت نہ پڑتی، اور وہ مذکورہ کتاب کے بنیادی مقصد پر اپنی توجہ کو مرکوز رکھتے۔

مذکورہ کتاب کے علاوہ ایک مفصل کتاب ”تنظیم فکر ولی اللّٰہی کیا ہے؟ عقائد، افکار، نظریات“ مولانا عمر فاروق صاحب (استاد جامعۃ الرشید، کراچی) نے بھی ترتیب دی ہے، جو ”مکتبہ نقشبندیہ، طارق روڈ، کراچی“ سے شائع ہوئی ہے۔

اس کتاب میں مؤلف نے تفصیل کے ساتھ مولانا سندھی کی طرف منسوب تالیفات نیز تنظیم

فکر ولی اللّٰہی کے لٹریچر سے ایسے حوالہ جات اور ان کی عکسی نقول شامل کی ہیں، جو کتاب وسنت سے متصادم ہیں۔

مذکورہ بالا کتاب کے مؤلف نے مولانا سندھی کی طرف منسوب جن کتب ومضامین کے اقتباسات نقل کیے ہیں، ان میں بعض ایسی کتب ومضامین بھی شامل ہیں، جو مولانا سندھی نے اپنی زندگی میں شائع کرائے، یا ان پر مولانا سندھی نے تقریظ لکھی یا تصدیق فرمائی، مثلاً ''شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ''، ''مولانا عبیداللہ سندھی: حالاتِ زندگی، تعلیمات، سیاسی افکار'' ''تفسیر الہام الرحمٰن''، ''قرآنی شعور انقلاب''، ''تفسیر سورہ مزمل، سورہ مدثر'' وغیرہ۔

وہ الگ بات ہے کہ مذکورہ کتاب کے مؤلف نے مولانا سندھی اور تنظیم فکر ولی اللّٰہی کے مشترکہ ومجموعہ مواد ولٹریچر میں مذکور افکار کی نسبت کسی وجہ سے تنظیم فکر ولی اللّٰہی کی طرف کی ہے، جبکہ بہت سی کتب ومضامین موجودہ تنظیم فکر ولی اللّٰہی کے قائم ہونے سے پہلے کے لکھے ہوئے یا طبع شدہ ہیں۔

فاضل مبصر کے نزدیک تنظیم فکر ولی اللّٰہی کا شمار تیسرے نقطۂ نظر کے قائلین میں ہوتا ہے، جو مولانا سندھی کی جملہ تحریرات وافکار کے مؤید ومدعی ہیں۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود فاضل مبصر کو جملہ تحریرات میں مذکور گمراہ کن افکار، تنظیم کے حاملین کی طرف منسوب ہونے کی بنیاد پر جاری شدہ فتاویٰ کے بارے میں تحفظات ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

> ''محض یکطرفہ بات کو ذکر کرنا پہلے سے طے شدہ ذہن کا نتیجہ ہوتا ہے، جو علمی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے افسوسناک ہے، اور علمی دنیا کے مسلمہ ضابطوں کے منافی''

(ماہنامہ ''الشریعۃ'' گوجرانوالہ، ستمبر 2016، صفحہ نمبر ۴۸)

یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ جو فتاویٰ اہلِ علم وہلِ تحقیق کی طرف سے باحوالہ ذکر کیے گئے ہیں، اور وہ امور خود تنظیم فکر ولی اللّٰہی کے لٹریچر میں موجود ہیں، اور جواب دینے والے تنظیم کے سرکردہ افراد کی نظروں سے بھی اوجھل نہیں، اور تنظیم کی بنیاد ہی اس قسم کے لٹریچر پر

ہے، اور تنظیم کے تین علماء کی طرف سے تحریر کردہ کتاب میں ان کی تردید یا تغلیط کا کوئی ذکر نہیں، نیز تنظیم کے بعض افراد کی طرف سے ان افکار کی تردید سے کیا پوری تنظیم (کے افراد کی طرف) سے بھی تردید ثابت ہوسکتی ہے؟ تو یہ کس طرح افسوسناک اور کون سے علمی دنیا کے مسلمہ ضابطوں کے خلاف ہے۔ ظاہر ہے کہ فاضل مبصر کی طرف سے یہ صرف دعویٰ ہے، جس کو خود دلیل سمجھ کر انہوں نے اتنا سخت حکم صادر فرما دیا ہے۔

رابعاً تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کے مذکورہ تین علماء کی طرف سے ''تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کی بابت فتووں کی حقیقت'' نامی کتاب اپریل 2006ء میں تحریر کی گئی، جبکہ اس سے تقریباً 6 سال قبل 4 ستمبر 2000ء میں وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے بورڈ نے اپنی مرکزی مجلسِ عاملہ میں ''تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی'' کے طرزِ عمل اور افکار ونظریات کے پیشِ نظر، اس کو بورڈ سے خارج کرنے کا فیصلہ درجِ ذیل الفاظ میں کیا:

> نام نہاد ''تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی'' سے وابستہ مدارس کا ''وفاق'' سے الحاق ختم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس تنظیم کے نظریات جمہور امت کے مؤقف کے منافی ہیں۔
>
> اس تنظیم کے خلاف دارُ العلوم کراچی، جامعہ فاروقیہ کراچی اور کوہاٹ، پشاور، فیصل آباد اور گوجرانوالہ کے مرکزی مدارس کے فتاویٰ آ چکے ہیں۔ اور ان کے خلافِ شریعت عقائد کے بارے میں کسی قسم کا ابہام نہیں رہا۔ لہٰذا جس مدرسہ کے مہتمم کا تعلق اس تنظیم سے ہوگا، اس مدرسہ کا الحاق وفاق سے ختم کر دیا جائے گا۔ اسی طرح کسی مدرسہ کے استاذ یا دوسرے ذمہ دار افراد کا تعلق اس تنظیم سے ہو تو وہ مدرسہ وفاق کی طرف سے اس کا پابند ہے کہ وہ متعلقہ فرد کو مذکورہ تنظیم سے تعلق ختم کرنے پر آمادہ کرے یا اس کو مدرسے کی ذمہ داری سے سبکدوش کر دے۔ بصورتِ دیگر ایسے مدرسے کا الحاق ختم کر دیا جائے گا (سہ ماہی وفاق ملتان شمارہ نمبر اص ۳۹ بابت ماہِ رجب، شعبان، رمضان 1421ھ)

مذکورہ فیصلہ وفاق المدارس العربیہ بورڈ کی مجلسِ عاملہ کا ہے، جس میں اس تنظیم کے خلاف متعدد معتبر جامعات و مدارس کے فتاویٰ جاری ہونے اور تنظیم کے عقائد شریعت کے خلاف ہونے کے بارے میں کسی قسم کے ابہام نہ رہنے کی تصریح ہے۔ یہ تحریری فیصلہ ہماری تالیف میں بھی شامل ہے۔

مولانا عبدالحق خان بشیر صاحب کی تالیف ''مولانا عبیداللہ سندھی اور تنظیم فکر ولی اللّٰہی'' کا پہلا ایڈیشن مارچ 2004ء میں شائع ہوا، جبکہ اس سے قبل یہ مضامین ماہنامہ ''حق چار یار'' لاہور میں بھی قسط وار شائع ہوئے، جو تنظیم کے تین علماء کی مذکورہ تالیف کی اشاعت سے پہلے کے زمانہ سے متعلق ہیں۔

پھر اس کے بعد تنظیم کے تین علماء کی طرف سے ''تنظیم فکر ولی اللّٰہی کی بابت فتووں کی حقیقت'' نامی کتاب میں یہ لکھنا:

> ''مولانا سلیم اللہ خان صاحب، بنوری ٹاؤن کے نائب مفتیان اور مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے ان فتاویٰ میں افتاء کے درج ذیل اہم اصولوں کو نظر انداز کر کے افتاء کو بازیچۂ اطفال بنا کر رکھ دیا۔ ان پر لازم تھا کہ کسی شخصیت یا تنظیم پر فتویٰ لگانے سے قبل حقیقی معلومات وشواہد حاصل کر کے حضرت امام شاہ ولی اللہ صاحب اور حضرت مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کے مستند لٹریچر کی روشنی میں فتویٰ دیتے۔
>
> مفتی صاحبان کے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تنظیم سے محض ذاتی عناد و بغض رکھتے ہیں، ایسے شخص کے فتوے کو فتویٰ کے بجائے اگر شہادت بھی فرض کیا جائے، تو بھی یہ عداوت اور کینہ پر مبنی شہادت ہے، جو شرعاً غیر معتبر ہے۔
>
> کسی پر گمراہی، دہریت یا کفر وغیرہ کا فتویٰ لگانے کے لیے انتہائی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے، مگر مدیر ''الفاروق'' مولانا سلیم اللہ خان اور دیگر حضرات نے

کسی خوفِ خدا کی پرواہ کیے بغیر ''انتہائی گمراہ، دہریت اور فتنہ'' جیسے نہایت غیر مہذب اور غیر محتاط الفاظ استعمال کیے ہیں (تنظیم فکر ولی اللّٰہی کی بابت فتوں کی حقیقت، صفحہ 25، 26، ناشر: شعبہ نشر واشاعت، تنظیم فکر ولی اللّٰہی، پاکستان، طبع اول: اپریل 2006ء)

کیا معنیٰ رکھتا ہے، اور ''تنظیم فکر ولی اللّٰہی'' کے مذکورہ سرکردہ حضرات کو یہ حق کس طرح حاصل ہوگیا کہ وہ بڑے بڑے اصحابِ علم کو فتاویٰ اور افتاء کے اہم اصولوں کو سمجھانے بیٹھ جائیں۔ اب تو دارالعلوم دیو بند نے بھی تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کے خلاف فتویٰ جاری کردیا ہے، جو زیرِ نظر کتاب کی اشاعتِ دوم میں صفحہ نمبر ۳۸۴ سے صفحہ نمبر ۳۸۶ تک محیط ہے۔ کیا تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کے رہنما دارالعلوم دیو بند کے مفتیانِ کرام کے بارے میں بھی یہ کہیں گے کہ وہ فتویٰ نویسی کے اصولوں سے ناواقف ہیں؟ واضح رہے کہ دارالعلوم دیو بند کے مفتیانِ کرام نے اپنے فتوے کی بنیاد تنظیم کے دستور پر رکھی ہے۔

ہمارا خیال تھا کہ فاضل مبصر نے ہماری کتاب میں مذکورہ عبارات کو ملاحظہ کیا ہوگا، اور اسی کے ساتھ ہی اس میں وفاق المدارس العربیہ کے فیصلہ اور دیگر فتاویٰ کو بھی بمع ان کی تواریخ کے ملاحظہ کیا ہوگا، لیکن انہوں نے اپنے تبصرہ میں ان چیزوں کو نظر انداز کردیا۔

تنظیمِ فکر ولی اللّٰہی کے بعض افراد کی طرف سے تنظیم کے خلاف جاری شدہ فتوں کے جواب پر تفصیلی گفتگو مولانا ڈاکٹر عبدالحکیم اکبری صاحب (سابق: مرکزی کنوینئر جمعیۃ طلبہ اسلام، پاکستان) نے اپنی کتاب ''تنظیم فکر ولی اللّٰہی اور اس کی قیادت حقائق کے آئینہ'' میں کی ہے، تفصیل وہاں ملاحظہ کرلی جائے۔ ہم ذیل میں اس کتاب کے چند اقتباسات نقل کرتے ہیں:

> علمائے حق علمائے دیو بند کے تمام ادارے، مدارس اور علماء نہایت معتدل مزاج کے حامل ہیں، وہ افراط وتفریط سے ہٹ کر اعتدال کی راہ پر چلتے ہیں۔ کسی پر گمراہی کا فتویٰ لگانا نہ ان کا کوئی شوق ہے، اور نہ ہی مشغلہ۔ ان کی از حد کوشش یہ ہوتی ہے کہ اگر کسی نے عقائد کے بارے میں ایسی بات کہہ بھی دی، جو گمراہ کن

ہو، وہ اس کی بھی تاویل کرتے ہیں، اس کی غلط بات کا صحیح محل ڈھونڈتے ہیں، اور یہ سارا اس لیے کرتے ہیں کہ وہ گمراہی، الحاد اور فسق وفجور کے فتویٰ سے بچ سکے۔

اور یہی بات جامعۃ العلوم الاسلامیہ، کراچی کے دارالافتاء کے مفتی نے اپنے مذکورہ بالا فتویٰ میں تحریر کی ہے، اور اسی کے پیشِ نظر حضرت شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خان مہتمم: جامعہ فاروقیہ، کراچی وصدر وفاق المدارس العربیہ، پاکستان نے بقول ڈاکٹر (محمود الحسن) عارف صاحب کے حضرت صاحبزادہ مولانا سید محسن شاہ صاحب شہید، مہتمم: جامعہ حلیمیہ، درّہ پیزو، لکی مروت کو خط تحریر فرما کران سے "تنظیم فکرولی اللّٰہی" کے عقائد کے بارے میں استفسار کیا ہے، یہ اسی محتاط رویے کا غماز ہے (تنظیم فکرولی اللّٰہی اور اس کی قیادت حقائق کے آئینہ میں، صفحہ 86، بعنوان "مولانا سعید احمد رائے پوری کے خط کا تجزیہ"، مطبوعہ: مکتبہ دیوبند، ڈیرہ اسماعیل خان، سنِ اشاعت 2014ء/1435ھ)

مولانا سعید احمد رائے پوری کا اپنے عقائد کے بیان کو صرف "المھند علی المفند" تک محدود کرنا کافی نہ تھا، بلکہ انہیں چاہیے تھا کہ دیگر تفصیلات کو ایک طرف رکھتے ہوئے وہ صرف ان غلط نظریات وخیالات جو اِن کے اپنی جماعتی آرگن "عزم سیریز" میں شائع ہوئے ہیں، جن کی نشاندہی حضرت مولانا عبدالحق خان بشیر نے اپنے مضمون میں جو کہ ماہنامہ "حق چار یار" میں شائع ہوا ہے (اور اب وہ مستقل کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے) اور وہ جن کی نشاندہی دیگر مفتی حضرات نے اپنے اپنے فتووں میں کی ہے، ان سے برأت، لاتعلقی اور رجوع کرنے کا اعلان کرتے اور ان حضرات کے شکریہ کے ساتھ ان کو اپنے رجوع سے آگاہ کرتے۔ حالانکہ انہوں نے اس اپنے مکتوب میں جو انہوں نے علمائے کرام کے نام لکھا ہے، مکمل خاموشی اختیار کی ہے، جس سے لازمی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط لکھتے وقت بھی ان کے وہی نظریات وخیالات تھے، جو

اس سے قبل ''عزم سیریز''، ''شعور و آگہی'' اور ''قرآنی شعور انقلاب'' اور دیگر ان کی تنظیمی نصاب میں شامل کتب میں سے ان کی طرف منسوب کیے گئے ہیں۔ آگاہ ہو کہ یہ خط 14 ستمبر 2000ء کا ہے، جبکہ اس کے بعد بھی ان کے حوالہ سے غلط نظریات وخیالات سامنے آتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی چاہیے تھا کہ جب مفتیانِ کرام کی طرف سے ان کے غلط نظریات وخیالات سے ان کو آگاہ کر دیا گیا تھا، تو جیسے ان کے پیروکار مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن نے اپنے مکتوب میں ''الہام الرحمٰن''، ''افادات وملفوظات'' اور ''المقام المحمود'' سے لاتعلقی کا اظہار کیا ہے، [1] مولانا سعید احمد رائے پوری بھی کرتے۔ ان کے وہ اقوال وخیالات جو اِن کی تنظیم کے رسائل وکتب میں درج ہیں، ان سے لاتعلقی ظاہر کرتے، اور رجوع کرنے کا اعلان کرتے، تو بات صاف ہو جاتی۔ اور اپنے کسی قول سے رجوع کرنا تو بڑے پن اور عظمت کی دلیل ہے، اور یہی ہمارے اکابر واسلاف کا طریقہ رہا ہے (ایضاً صفحہ ۸۸)

کیا مولانا سعید احمد رائے پوری نے اس پر عمل کیا ہے؟ جب وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ ان کی طرف منسوب عقائد ونظریات غلط ہیں، اور مفتی حضرات نے اس پر گرفت کی ہے، تو وہ کھلے دل سے تسلیم کرتے کہ یہ میری غلطی تھی، اور میں ان سے رجوع کرتا ہوں، اور برأت ولاتعلقی کا اعلان کرتا ہوں، اور مستفتی ومفتی حضرات دونوں کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے اپنی غلطی سے آگاہ کیا۔ مگر افسوس اپنی روایتی ضد اور اَنا کی وجہ سے انہوں نے باوجود نشاندہی کے اپنے غلط نظریات وخیالات سے نہ تو رجوع کیا، اور نہ ہی اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے اس سے لاتعلقی ظاہر کی۔

---

[1] ملحوظ رہے کہ مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن نے ''تفسیر المقام المحمود'' کی پرزور انداز میں تحسین کی اور اس پر تقریظ لکھی ہے، اور وہ تنظیم فکر ولی اللّٰہی کے موجودہ صدر ہیں۔ ہمیں اب تک کسی معتبر ذریعے سے معلوم نہیں ہو سکا کہ انہوں نے تفسیر ''المقام المحمود'' پر اپنی تقریظ سے رجوع کر لیا ہے۔ (محمد رضوان)

اس لیے وہ تمام فتوے اپنی جگہ برقرار ہیں، اوران فتووں کی رو سے جو بھی ان خیالات ونظریات کا حامل ہوگا، وہ گمراہ ہے (ایضاً صفحہ ۸۹)

فتویٰ کسی ذات، فرد یا شخصیت کے خلاف نہیں ہوتا۔ وہ ان عقائد، نظریات اور خیالات کے خلاف ہوتا ہے، جو کسی ذات، فرد یا شخصیت کی طرف منسوب ہوں۔

مولانا سعید احمد رائے پوری اوران کے متعلقین کے بارے میں ان کے جو عقائد، نظریات، اور خیالات انہی کی تنظیم کی کتابوں سے یا اس کی شائع کردہ کتب سے اوران کی تقاریظ وتصدیقات سے مطبوعہ کتب ورسائل اوران کی وہ تقاریر و بیانات جو بعد میں انہی کے زیرِ اہتمام وزیرِ نگرانی شائع ہونے والی کتب ورسائل اور جرائد وسیریز میں شائع ہوئے ہیں، ان سے وہ نہ تو رجوع کرتے ہیں، اور نہ ہی ان کتب ورسائل اور جرائد وسیریز سے لاتعلقی کا اعلان کرتے ہیں، تو فتوے توان کتب ورسائل میں ان کے شائع عقائد ونظریات کی بنیاد پر دیئے گئے تھے، وہ موجود ہیں، اوران کی نسبت بھی اپنی طرف کرتے ہیں، تو فتووں کی بھی وہی حیثیت ہوگی، وہ بحالہ موجود رہیں گے (ایضاً صفحہ ۱۰۶)

زیرِ نظر مکتوب میں مولانا سعید احمد رائے پوری لکھتے ہیں:

''آج کل بعض شر پسند عناصر نے خودساختہ چند غلط عقائد بنا کر میری طرف منسوب کرنے کی انتہائی مکروہ کوشش کی ہے، تاکہ خانقاہِ رائے پور کے عظیم سلسلہ اور میرے متعلق لوگوں کے ذہنوں میں شکوک وشبہات پیدا کیے جائیں''

راقم الحروف کو یہ علم نہیں ہے کہ ان عناصر کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ ان کی طرف غلط، خودساختہ عقائد منسوب کرنے کی ''مکروہ'' کوشش کریں۔ حقیقت یہ نہیں ہے، بلکہ یہ غلط عقائد ونظریات ان کے اپنے ہیں۔ اور جب ان کی نشاندہی کی جاتی ہے، اور عام لوگوں کو ان عقائد ونظریات سے آگاہ کیا جاتا ہے، تو وہ

''شر پسند'' ٹھہرائے جاتے ہیں۔ ذرا غور تو کیجیے کہ جن کو وہ شر پسند ٹھہرا رہے ہیں، وہ یہ ادارے، مدارس اور مفتیینِ کرام ہیں، جن میں دارالعلوم کراچی، جامعۃ العلوم الاسلامیہ [بنوری ٹاؤن] کراچی، جامعہ فاروقیہ کراچی، جامعۃ الرشید کراچی، دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک، دارالعلوم الاسلامیہ ٹل، دارالعلوم الاسلامیہ تر ناب، مدرسہ اسلامیہ زرگری شامل ہیں، اور سب سے قابلِ ذکر دارالعلوم دیوبند ہے کہ ان کے مفتیین صاحبان کی طرف سے بھی فتویٰ کی کاپی موصول ہوگئی ہے۔ یہ ادارے اور ان کے مفتیینِ عظام شر پسند عناصر ہیں، ذرا خدا کا خوف کیجیے (ایضاً صفحہ ۱۰۹، ۱۱۰)

حضرت خواجہ مولانا خان محمد صاحب قدس سرہٗ سے ایک مکتوب کے جواب میں جو مکتوب لیا گیا تھا، اس میں مولانا سعید احمد رائے پوری کے ان عقائد کا ذکر تک نہیں کیا گیا تھا، جو مفتیین حضرات کے فتووں کی بنیاد بنے ہیں، ایک مجمل خط کے جواب میں انہوں نے یہ لکھا تھا (ایضاً صفحہ ۱۱۲)

دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے رئیس مفتی دارالافتاء حضرت مولانا مفتی محمد فرید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ ''تنظیم فکر ولی اللّٰہی'' کے خلاف صادر ہوا ہے، اور موجودہ رئیس مفتی دارالافتاء حضرت مولانا سیف اللہ حقانی کا فتویٰ بھی ان کے خلاف جاری ہوا ہے، مولانا سیف اللہ حقانی صاحب کا فتویٰ مذکورہ تمام فتاویٰ میں بہت دوٹوک ہے، انہوں نے ان عقائد ونظریات وخیالات رکھنے والوں کو ''خارج از اسلام قرار دیا ہے'' یہ دونوں حضرات (یعنی مولانا سمیع الحق صاحب اور مولانا سید شیر علی شاہ صاحب) مولانا قاضی عبدالعلام کو تو تنظیم کے خلاف پروپیگنڈے سے روکتے ہیں، مگر اپنے مدرسہ کے مفتیین کو تنظیم کے خلاف فتویٰ دینے سے نہ تو روکتے ہیں، اور نہ اپنے فتووں سے رجوع کرنے کا حکم صادر فرماتے ہیں (ایضاً صفحہ ۱۱۳)

جن مفتیین حضرات نے (تنظیم فکر ولی اللّٰہی کے خلاف) فتوے جاری کیے ہیں، ان کی تفصیل اسی مضمون میں دی گئی ہے۔ تردید کرنے والوں میں تو کسی مفتی صاحب کا نام نہیں، تو پھر تردید کا کیا معنیٰ؟ تردید کا معنیٰ تو یہ ہے کہ انہوں نے پہلے جو فتوے جاری کیے تھے، ان سے رجوع کرتے ہوئے ان کی تردید کی ہے (ایضاً صفحہ ۱۱۵)

خلاصہ یہ کہ وفاق المدارس کی طرف سے تنظیم فکر ولی اللّٰہی کے متعلق جو فیصلہ کیا گیا، وہ ابہام دور ہونے اور تحقیق و غور وفکر کے بعد کیا گیا۔ اور تنظیم فکر ولی اللّٰہی کے متعلق جو فتاویٰ جاری کیے گئے، وہ ان کے افکار کی روشنی میں باحوالہ جاری کیے گئے، اور یہ افکار تنظیم فکر ولی اللّٰہی کے نصابی لٹریچر اور ان کی طرف سے شائع شدہ لٹریچر میں موجود ہیں۔ مگر تنظیم کے بانی اور دیگر حضرات نے صراحتاً ان افکار سے رجوع یا تنظیم سے برأت و علیٰحدگی کا اعلان نہیں کیا، بلکہ اس کے برعکس مفتیانِ کرام کو موردِ الزام ٹھہرادیا گیا۔ تنظیم کے بعض سرکردہ حضرات کی طرف سے جن فتاویٰ کو اپنے مقصد کے لیے پیش کیا گیا ہے، وہ یا تو مذکورہ فیصلہ اور تنظیم کے افکار کی تحقیق ہونے سے پہلے کے ہیں، یا اُن میں سابقہ فتووں سے رجوع یا ان کی تغلیط کا ذکر نہیں۔ اور اس سلسلہ میں تنظیم والوں کی طرف سے مرتب کردہ سوالات بھی مبہم ہیں، جن میں تنظیم کے مذکورہ افکار کا ذکر نہیں کیا گیا۔

بہرحال ماہنامہ ''الشریعۃ'' کے فاضل مبصر کے تبصرہ میں کئی امور مبہم و مجمل تھے، جن کی وجہ سے غلط فہمیوں کا امکان تھا، اس لیے ہم نے ماقبل میں ان کی توضیح و تشریح کردی ہے۔

وَاللّٰہُ سُبۡحَانَہٗ وَتَعَالٰی اَعۡلَمُ وَعِلۡمُہٗ اَتَمُّ وَاَحۡکَمُ.

(2)

مولانا سندھی کی فکر کے بارے میں مزید تحریریں

جہاں تک مرسلہ مکتوب میں ذکر کردہ دوسری بات کا تعلق ہے، تو سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے ایک تبصرہ تو پروفیسر محمد سرور صاحب کی مؤلفہ کتاب ''مولانا عبیداللہ سندھی'' پر تحریر کیا تھا، جو اِن کے ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' جولائی، اگست، ستمبر 1944ء میں شائع ہوا تھا اس تبصرے کے اختتام پر بندہ محمد رضوان نے اپنی معروضات پیش کی ہیں، اور ہمارے ایک رفیق کار نے اس تبصرے پر کچھ حواشی بھی تحریر کیے ہیں۔

واضح رہے کہ اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن 1967ء میں ''مولانا عبیداللہ سندھی: حالاتِ زندگی، تعلیمات اور سیاسی افکار'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔

اس کے علاوہ سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے ایک تبصرہ مولانا سندھی کی ایک کتاب ''شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک'' پر تحریر کیا تھا، جو ان کے ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' اپریل 1942ء میں شائع ہوا تھا۔

نیز جناب ماہر القادری صاحب نے پروفیسر محمد سرور صاحب کی کتاب ''مولانا عبیداللہ سندھی: حالاتِ زندگی، تعلیمات اور سیاسی افکار'' پر ماہنامہ ''فاران'' کراچی کے اکتوبر 1974ء کے شمارے میں ایک تبصرہ لکھا تھا۔

اس کے علاوہ مولانا مسعود عالم ندوی کی مرتبہ کتاب ''مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے افکار وخیالات پر ایک نظر'' پر مولانا سید ریاست علی ندوی نے جنوری 1945ء کے ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ میں ایک تبصرہ لکھا تھا۔

آگے آپ کی خواہش پر مذکورہ چاروں تحریریں پیش کی جا رہی ہیں۔

''مولانا عبید اللہ سندھی'' مؤلّفہ پروفیسر محمد سرور پر تبصرہ

(از: سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب)

مولانا سندھی مرحوم، جن کی وفات زمانہ حال کا ایک قومی سانحہ ہے، ان لوگوں میں سے تھے جو اپنے مقصد اور تخیل کے پیچھے اپنا پورا سرمایۂ زندگی لگا دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ لوگ بھی ان کے احترام پر مجبور ہیں، جو اِن کے خیالات سے اتفاق نہیں رکھتے۔ لیکن مولانا مرحوم اپنے خیالات کو عمل میں لانے کا جتنا زبردست جوش اور ولولہ رکھتے تھے، انہیں سمجھانے کی اتنی قدرت نہ رکھتے تھے۔ ان کا تخیل ایک شارح کا محتاج تھا، جو اِن کی بات سمجھ کر دوسروں کو اچھی طرح سمجھائے۔ یہی خدمت ان کے لائق شاگرد پروفیسر محمد سرور صاحب نے انجام دی۔ خود مولانا سندھی مرحوم بھی اپنی زندگی میں ان کی توثیق فرما چکے ہیں کہ یہ ان کے مافی الضمیر کی اچھی ترجمانی ہے، لہٰذا یہ کتاب اس لحاظ سے، اور صرف اسی لحاظ سے خیر مقدم کی مستحق ہے کہ یہ قریبی عہد کے ایک ایسے صاحبِ فکر کی واضح ترجمانی کرتی ہے جو خود اپنے آپ کو اچھی طرح نہ سمجھا سکا تھا۔

گر تو بُرا نہ مانے

لائق مولف نے اس کتاب میں مولانا مرحوم کے حالاتِ زندگی سے بہت کم تعرض کیا ہے۔ ان کی توجہ زیادہ تر مرحوم کے خیالات ہی کی طرف منعطف رہی ہے۔ اور اس سلسلہ میں ان کا دائرہ بیان بہت وسعت اختیار کر گیا ہے، حتیٰ کہ فلسفہ، مذہب، اخلاق، تصوف، تاریخ اور سیاسیات کے بکثرت مسائل اس کی لپیٹ میں آ گئے ہیں۔ ایسی ایک وسیع المبحث کتاب پر، خصوصاً جبکہ وہ اپنے نقطۂ نظر میں کافی غرابت بھی رکھتی ہو، ایک مختصر تبصرے میں تنقید کا حق پوری طرح ادا نہیں کیا جا سکتا۔ مجملاً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مذکورہ بالا مسائل کے بارے میں جو طرزِ فکر ان کے اندر پایا جاتا ہے، وہ ہندوستان میں کوئی نیا طرزِ فکر نہیں ہے، بلکہ نانک ا ،

کبیر ۲ ، اکبر ۳ ، داراشکوہ ۴ اور رام موہن رائے ۵ وغیرہم کے ذریعہ پہلے بھی ہندوستان اس سے آشنا ہوتا رہا ہے۔

فرق اگر ہے تو روح میں نہیں بلکہ موادِ بحث، طریقِ استدلال اور تفصیلات میں ہے، اور سب سے بڑھ کر اس امر میں کہ اس طرزِ فکر کو اسلام اور اصلی اسلام کا جامہ پہنا کر پیش کرنے کی اتنی بے باکانہ کوشش اس سے پہلے نہیں کی گئی تھی۔

ہمارا کام بھی نسبتاً بہت ہلکا اور کم ناخوشگوار ہوجاتا اگر ان خیالات کو محض ایک فکرِ آزاد کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہوتا۔ لیکن چونکہ انہیں فکرِ اسلامی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور بتکرار ان دعوؤں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ اصل دین یہ ہے، نہ کہ وہ جو مولانا سندھی سے ملاقات رکھنے والے سمجھے ہیں، اس لیے ہم اس دِلی تکلیف کے ساتھ جو مولانا مرحوم کے ہر مخلص نیاز مند کو ان کی وفات کے اس قدر قریب زمانے میں ان کے خیالات پر تنقید کرتے ہوئے محسوس ہونی چاہیے، بعض ایسے بنیادی امور کی طرف اشارہ کردینا ضروری سمجھتے ہیں، جو اس مجموعۂ افکار میں اسلامی طرزِ فکر سے صریحاً متصادم نظر آتے ہیں۔

مذہب اور تاریخ

''تمام مذاہب کی تعلیمات کو الگ رکھ کر تاریخِ انسانیت کا مطالعہ کرو، تو اصولِ ارتقاء اور اصولِ زوال مل جائیں گے''۔

اگر یہ سچ ہے، تو سوال یہ ہے کہ پھر سلسلۂ نبوت ووحی کی کیا ضرورت ہے؟ ہم تاریخِ انسانیت کے مطالعہ سے خود اپنے لیے حسبِ ضرورت قانونِ ارتقاء مستنبط کرسکتے ہیں۔ دنیا کا ہر نظام پچھلے تجربات سے استفادہ کر کے ہی بنتا ہے۔ پھر آخر پیغمبر کس لیے آتے رہے؟ مفکرین ہی اس کام کے لیے کافی تھے۔ دراصل اس نظریہ میں ایک غلط فہمی چھپی ہوئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تاریخِ انسانیت کے تجربات ہماری رہنمائی کرتے ہیں، مگر ان سے ترقی وتنزل کے قوانین اخذ کرنے اور واقعات کے اسباب وعلل تلاش کرنے کے لیے جس ہمہ بین نظر اور

جس بے لاگ تفکر کی ضرورت ہے وہ کسے حاصل ہے؟ کون ایسا انسان ہے جو تمدن کی مشینری کے پیچیدہ اجزاء کے عمل و تعامل کو بہمہ وجوہ سمجھتا بھی ہو، اور پھر ان سے نوامیسِ عاملہ کو تلاش کرتے وقت خواہشات، جذبات اور تعصّبات سے اپنے ذہن کو یکسر خالی بھی کر سکے۔ انسان کی یہی کمزوری نبوت کی اہمیت کو نمایاں کرتی ہے۔ اگر چہ نبی جو قانونِ اخلاق اور نوامیسِ حیاتِ اجتماعیہ پیش کرتا ہے، ان کے لیے وہ بھی استشہاد تاریخِ انسانیت ہی سے کرتا ہے، مگر اس کی آنکھ جہالت اور خواہش اور تعصب کے شیشوں سے ڈھکی ہوئی نہیں ہوتی۔

مشیتِ الٰہی اور رضائے الٰہی

''مولانا کا یہ عقیدہ ہے کہ زمانہ کا تقاضا خدا کی مشیت کے تابع ہوتا ہے۔ اور زندگی کے اسباب و حالات جس نظام کے متقاضی ہوتے ہیں، خدائی مصلحت اُسی نظام کو دنیا میں نافذ کرنا چاہتی ہے''۔

یہاں قضائے الٰہی اور رضائے الٰہی کے فرق کو نظر انداز کر کے ایک ایسی عظیم الشان بنیادی غلطی کی گئی ہے۔ جسے اگر اس کے منطقی نتائج تک پہنچا دیا جائے، تو ضلالت اور ہدایت، فسق اور طاعت، صلاح اور فساد سب یکساں ٹھہرتے ہیں، بلکہ حق و باطل کا امتیاز ہی سرے سے ختم ہو جاتا ہے۔ بلا شبہ اقتضائے زمانہ سے جو کچھ رونما ہوتا ہے، وہ مشیت یا قضائے الٰہی کے تحت ہی رونما ہوتا ہے، مگر حق پر یہ کتنا بڑا ظلم ہوگا کہ جو کچھ زمانے کے تقاضے سے رونما ہوا، اس کو حق کہہ دیا جائے۔ ''زمانہ کا تقاضا'' ہی اگر تعمیرِ مستقبل کے لیے محرک اور اساس ہو، تو پھر ''افق کے اس طرف سے'' کسی جداگانہ فوق الفطری تحریک اصلاح و انقلاب اور تعلیمِ حق کے آنے کی کیا حاجت باقی رہ جاتی ہے۔ زمانہ کا تقاضا تو قوموں کو ہر راہ پر چلاتا ہے چاہے وہ راہ عیاشی کی ہو، سرمایہ پرستی کی ہو، الحاد کی ہو، یا ظلم کی، اور پھر قومیں جس راہ پر بھی جانا چاہتی ہیں، قضائے الٰہی ان کے حق میں اسی کا فیصلہ کر دیتی ہے، مگر اس سے بڑی کوئی گمراہی نہیں ہو سکتی کہ اس قضا کو حجت قرار دے کر ایسی سب راہوں کو صراطِ مستقیم سمجھ لیا جائے۔

وحدۃ الوجود

''تمام موجودات میں جو چیز مشترک ہے۔ وہ وجود ہے......اس وجود سے ''ہونا'' مراد نہیں، بلکہ وہ حقیقت مراد ہے، جس کی بناء پر ہم کسی چیز کو موجود کہتے ہیں۔ یہ حقیقت اپنی جگہ بلا کسی موجود کرانے والے کے موجود ہے......اب جو چیزیں اس وجود کے علاوہ مخلوقات میں پائی جاتی ہیں، وہ اعتباری ہیں، اس لیے اگر وجود ہو تو ان سب کا خاتمہ ہے۔ لہٰذا یہی وجود خدا تعالیٰ کی عین ذات ہے۔ اور دنیا کی جتنی چیزیں ہیں، ان سب کی حقیقت یہی وجود ہے'' (بحوالہ شاہ محمد حسین صاحب الٰہ آبادی)

یہاں اس عقیدے کی عقلی و نقلی غلطیوں پر بحث کرنے کا موقع نہیں۔ مختصر یہ ہے کہ یہ ایک شدید ترین گمراہی کا فلسفہ ہے۔ جسے صوفیوں کے ایک گروہ سے سندِ حقانیت مل جانے کے باعث تقدس کا مقام حاصل ہو گیا، اس کی جو تقریر مصنف نے شاہ محمد حسین صاحب کے حوالہ سے نقل فرمائی ہے، اس کو اگر تسلیم کر لیا جائے، تو اس کے معنیٰ یہ نکلیں گے کہ تمام موجودات کے اندر خدا خود کام کر رہا ہے، اور جب یہ بات ہے، تو پھر دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے، صحیح ہو رہا ہے، غلطی کا اس میں کچھ کام نہیں۔ یہی عقیدہ اقتضائے زمانہ (تاریخ) کو ''ارادۂ ربانی'' بنا دیتا ہے، اور پھر انسان کو اس بات پر آمادہ کر دیتا ہے کہ رفتارِ زمانہ پر یہ سمجھتے ہوئے بہتا چلا جائے کہ یہ سب کچھ منشائے الٰہی ہے، اسی عقیدے سے ہیگل کا تصورِ تاریخ ۶ پیدا ہوا ہے، جس کا مدعا یہ ہے کہ اعتباری تشخصات و تعینات کے اندر جو جوہر اصلی کام کر رہا ہے، وہ ہر جگہ ایک ہی ہے، اور وہ دو متضاد طاقتوں کا روپ دھار کر تصادم در تصادم کا معرکہ چھیڑے ہوئے ہے، تاکہ اپنی تکمیلِ منزل کو پہنچ سکے۔ تاریخ کا یہ باطل تصور منجملہ اور بہت سے غلط نتائج کے ہم کو اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ نوعِ انسانی اضطراراً سیدھی ارتقاء کی راہ پر بڑھی چلی جا رہی ہے۔ حالانکہ اسلام کا دعویٰ یہ ہے کہ انسان جب انبیاء کی ہدایت کو مان لیتا ہے، تو تاریخ ارتقاء کرتی ہے، اور جب وہ اس ہدایت سے روگردانی کر لیتا ہے، تو تنزل شروع ہو جاتا ہے۔

وحدتِ ادیان

"تمام انسانوں میں ایک وحدتِ فکری ہے، اور ان میں یہی ایک نقطہ اشتراک ہے، اور اسی سے ادیان، اجناس اور اقوام کے اختلافات کم ہو جاتے ہیں، نیز قرآن اور دوسری کتابیں اسی وحدتِ فکری کی ترجمان ہیں"

یہ وحدتِ ادیان اس تصور کی ایک ذرا سی جھلک ہے، جسے مصنف نے مولانا کی ترجمانی کرتے ہوئے کافی شرح وبسط کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اول تو یہ تصور وحدۃُ الوجود کے اس فلسفے کا قدرتی اقتضا ہے، جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، مزید برآں مولانا مرحوم نے جس طرز پر نیشنلزم اور بین الاقوامیت کو یکجا جمع کیا تھا، اس کا بھی یہ لازمی تقاضا تھا کہ ایک طرف تو وہ بین الاقوامیت کی خاطر (اور ہندوستان کی نیشنلزم کی خاطر بھی) وحدتِ ادیان کا ایک فلسفہ وضع کرتے۔ اور دوسری طرف مخصوص مذہبی شرائع اور قوانین، اور تہذیبی صورتوں کو قومی خصوصیات قرار دے کر ان کے ترک واختیار کی آزادی تمام قوموں کے لیے ثابت کرتے۔ چنانچہ انہوں نے یہی کیا ہے۔ وہ چند مطلق (بے صورت) صداقتوں کو اصل دین قرار دے کر کہتے ہیں کہ وہ تمام ادیان اور تمام انسانوں میں مشترک ہیں۔ اور قرآن دراصل انہی کی طرف دعوت دینے آیا ہے۔ پھر ان شرائع، اور سنن کو جو قرآن اور اسوۂ محمدی میں مقرر کی گئی ہیں اور جن پر عہدِ نبوت اور خلافتِ راشدہ میں مذہبی، معاشرتی، تمدنی اور سیاسی زندگی کی تشکیل کی گئی تھی، محض قومی رسوم قرار دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ان رسوم کو عالم گیر قانونِ زندگی بنانا مقصود نہ تھا، بلکہ دینِ مطلق کے اندر ان رسوم کو قومی حالات وضروریات کے مطابق ڈھالنے اور بدل لینے کی گنجائش ہے۔

مصنف کے الفاظ میں اس کی تقریر ملاحظہ ہو:

الف: "جو پانی بہہ جاتا ہے وہ لوٹتا نہیں۔ قرآن پر عمل کر کے خلافتِ راشدہ کے دور میں صحابہ نے جو حکومت بنائی، اب بعینہٖ ویسی ہی حکومت نہیں بن سکتی"۔

ب: ''قرآن کی تعلیم کا نتیجہ ایک زمانہ میں ایک خاص مظہر میں جلوہ گر ہوا۔اب ضروری نہیں کہ دوسرے زمانہ میں وہ پھر بعینہٖ اسی صورت میں ظاہر ہو''۔

ج: ''اگر صرف پہلے کے بنے ہوئے شرع و آئین پر ہی سارا انحصار ہے تو پھر قرآن کی اثر آفرینی کا انجام ظاہر ہے''۔

د: ''اسلام کی اجتماعی اساسی تحریک قرآن شریف میں منضبط ہے۔اور وہ غیر متبدل رہے گی۔لیکن جہاں کہیں کسی قانون پر عمل درآمد شروع ہوتا ہے، تو مخاطبین کی حالت کے مطابق چند تمہیدی قوانین بنائے جاتے ہیں۔قانونِ اساسی تو غیر متبدل ہوتا ہے، لیکن تمہیدی قوانین ضرورت کے وقت بدل سکتے ہیں۔ہم سنت ان ہی تمہیدی قوانین کو کہتے ہیں''۔

ھ: ''مولانا کے نزدیک بھی (قرآن میں) کہیں کہیں جو احکام ہیں، وہ دراصل ایک مثال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان احکام کو اپنی خاص شکل میں ابدی اور عالمگیر ماننا صحیح نہیں''۔

ایک مختصر تبصرے میں زیادہ اقتباسات کی گنجائش نہیں نکل سکتی۔تاہم ان چند اقتباسات سے مولانا کے خیالات کا بہت کچھ اندازہ ہوسکتا ہے۔ایک فلسفی ہونے کی حیثیت سے ہر سوچنے والے کو ہر بات سوچنے کا اختیار ہے۔مگر یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ قرآنی تعلیمات، اور سنتِ محمدی کے ایک حصہ کو دائمی اور عالمگیر اور دوسرے حصہ کو قومی اور وقتی قرار دینے اور پھر بلا دلیل وسند یہ کہنے کا کسی کو کیا حق ہے کہ دراصل یہی قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا مدعا تھا۔

جو اماں ملی تو......

اس کے بعد مولانا کے تخیل کی آخری منزل ہمارے سامنے آجاتی ہے۔شرائع اور سنن کو وقتی اور قومی قرار دینے کے بعد مولانا یہ چاہتے تھے کہ اس دینِ مطلق کو، جس کا تصور اوپر بیان ہوا

ہے، لے لیا جائے، اوراس کے ساتھ قرآنی ومحمدی شرائع وسنن کے بجائے ان شرائع وسنن کا جوڑ لگایا جائے، جو ہم کو یورپ اور اشترا کی روس وغیرہ سے ملتے ہیں۔ان کے نزدیک یورپ اور اشترا کی روس کے طریقوں میں اگر کوئی قصور ہے، تو صرف یہ ہے کہ ان کے ساتھ دینِ مطلق کا جوڑ لگا ہوا نہیں ہے۔اس مضمون کو بھی مصنف نے کافی شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔نمونہ کے طور پر چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''میں چاہتا ہوں کہ یورپ کی اس مادی ترقی کو تسلیم کرلیا جائے، یعنی علمِ سائنس کی ترقیوں کو ہم اساس کی حیثیت دیں''۔

''میں مادیین کے تصورِ کائنات کو سرے سے غلط نہیں مانتا، لیکن اسے ناقص ضرور سمجھتا ہوں۔ مادی فکر کا منکر نہیں ہوں، لیکن یہ جانتا ہوں کہ مادیت حقیقت کا ایک رُخ ہے۔اور یہ رُخ بے شک حقیقت کے ایک پہلو کا صحیح ترجمان ہے''۔

''اس میں شک نہیں کہ اشترا کیت مادی زندگی کی تنظیم کا منتہائے کمال ہے''۔

''نیا روس بالکل لادینی تھا، اور مولانا پکے دیندار۔لیکن مولانا کی دینداری نے انقلابیوں کی اس لادینی میں بھی صحیح جذبہ کو سرگرمِ عمل پایا......آپ نے کھلے دل سے روسی انقلاب کی ہر اچھی چیز کو سراہا، اور انقلاب برپا کرنے والوں کی معجزانہ قوتوں کو تسلیم کیا۔لیکن اس کے باوجود آپ مسلمان ہی رہے''۔

صاف اور سیدھی زبان میں اگر اسے بیان کیا جائے تو یوں کہا جاسکتا ہے کہ صرف چند مطلق مذہبی تصورات قرآن سے لے لیے جائیں۔اور قرآن ہی سے کیوں؟ وہ تو تمام مذاہب و ادیان میں ہیں ہی مشترک! رہی شریعت اور تہذیب وتمدن ومعاشرت کی مخصوص شکل، تو اس معاملہ میں قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ پیش کیا تھا، وہ صرف عرب کی قوم کے لیے تھا، لہٰذ ہمیں آزادی ہے کہ اسے کلاًّ یا جزءاً اپنے لیے منسوخ ٹھہرا کر شریعتِ فرنگ اور سننِ روسیہ کو اختیار کرلیں۔

جدھر دیکھتا ہوں

تخیل کی ان بے پایاں وسعتوں کو لیے ہوئے مولانا جب تاریخِ اسلام پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو انہیں خلفائے راشدین، بنوامیہ، بنوعباس، اکبر اور اورنگزیب سب ہی یکساں قابلِ قدر اور قابلِ تعریف نظر آتے ہیں، کیونکہ مذکورہ بالا نظریات کو ایک نظامِ فکر کی شکل میں مرتب کر کے جو شخص بھی دنیا پر نگاہ ڈالے گا، اسے باطل تو کہیں نظر ہی نہیں آ سکتا، تمام مختلف چیزیں خواہ وہ ایک دوسرے کی ضد ہی کیوں ہوں، اس کے تخیل کی فضائے مطلق میں حق کی جگہ پا سکتی ہیں۔

اگر ہم حسنِ ظن سے کام لیں، تو کہہ سکتے ہیں کہ مولانا مرحوم کے نظامِ فکر کے بیشتر اجزا ایسے تھے، جو ان کا اصل عقیدہ و مسلک نہ تھے، بلکہ انہوں نے یہ ایک جدید علمِ کلام محض اس لیے مرتب کیا تھا کہ ان کے نزدیک موجودہ زمانہ میں دین کی دعوت انہی اصولوں پر پھیلائی جا سکتی تھی۔ لیکن اس حسنِ ظن کے باوجود ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ یہ فلسفہ اور کلام قطعی غلط اور سراسر ضلالت ہے۔ اور اگر دین کی دعوت پھیلنے کی بس یہی ایک صورت رہ گئی ہے تو اس طرح اس کے پھیلنے سے نہ پھیلنا ہزار درجہ بہتر ہے۔ مولانا مرحوم کی یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ ان کا تعلق علمائے کرام کے اس طبقہ سے تھا۔ جو اپنی گروہ بندی کی عصبیت میں حدِ کمال تک پہنچا ہوا ہے، یہی وجہ ہے کہ مولانا یہ سب کچھ فرما گئے، اور لکھوا اور چھپوا بھی گئے، اور پھر بھی تنقید کی زبانیں بند اور تعریف کی زبانیں تر رہیں، ورنہ اگر کہیں انہوں نے اس طبقہ خاص سے باہر جگہ پائی ہوتی۔ تو ان کا استقبال سر سید اور ''علامہ'' مشرقی سے کچھ کم شاندار نہ ہوا ہوتا۔

(ماخوذ از ''ادبیاتِ مودودی'' صفحہ 303 تا صفحہ 311، مرتبہ: پروفیسر خورشید احمد، مطبوعہ: مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، بارِ دوم: جولائی 1985ء)

حواشی

(از مفتی محمد امجد حسین)

۱۔ بابا نانک یا گرونانک، شیخ محمد اکرام کی کتاب ''آبِ کوثر'' کے مطابق 1469ء میں پیدا ہوئے، اور 1538ء میں وفات پاگئے، آپ سکھ مذہب کے بانی تھے۔ انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے عقائد کو ملا کر وسیع المشربی کی ایک تحریک جاری کی۔

۲۔ شیخ محمد اکرام کی کتاب ''آبِ کوثر'' کے مطابق ''کبیر'' 1440ء میں پیدا ہوئے، اور 1518ء میں وفات پاگئے۔ کبیر اور بابا نانک کی تعلیمات میں خاصی مماثلت ہے۔ آپ نے بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے عقائد کو ملا کر وسیع المشربی کی ایک تحریک جاری کی۔ آپ نے کہا کہ ''رام'' اور ''رحیم'' ایک ہیں۔ آپ مسجد اور مندر دونوں کو فضول سمجھتے تھے، اور خدا کی محبت اور انسان دوستی کو ذریعۂ نجات سمجھتے تھے۔ نانک اور کبیر دونوں کو مورخین نے وحدتِ ادیان کے رجحان کا حامل قرار دیا ہے۔ دونوں ''بھگتی تحریک'' کے نمائندے تھے۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی کی کتاب ''تاریخ دعوت و جہاد: برصغیر کے تناظر میں'' صفحہ 71 تا 74۔ شائع کردہ: ادارۂ معارفِ اسلامی، منصورہ، ملتان روڈ، لاہور۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ''مرکزی مکتبۂ اسلامی، دہلی سے شائع ہوا)

۳۔ مغل بادشاہ جلال الدین اکبر (1542ء-1605ء) نے ایک نیا مذہب جاری کیا، جسے ''دینِ الٰہی'' سے موسوم کیا گیا۔ یہ ہندومت، عیسائیت اور زرتشتیت کا ملغوبہ تھا (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ''دینِ الٰہی اور اس کا پس منظر'' از پروفیسر محمد اسلم، ندوۃ المصنفین، لاہور/ دہلی، ''ماہنامہ ''الفرقان'' بریلی کا مجدد الف ثانی نمبر'' مرتبہ: مولانا محمد منظور نعمانی، ''حضرت مجدد الف ثانی'' از مولانا سید زوّار حسین شاہ، ''تجدید و احیائے دین'' از سید ابوالاعلیٰ مودودی، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور)

۴۔ داراشکوہ (1615ء-1659ء) مغل بادشاہ شاہ جہاں کا سب سے بڑا بیٹا اور ولی عہد تھا۔ ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی اپنی کتاب ''تاریخ دعوت و جہاد: برصغیر کے تناظر میں'' لکھتے ہیں:

> دارا عقیدہ و فکر کے لحاظ سے آزاد خیال، وسیع المشرب اور ویدانتی فلسفے سے متاثر تھا۔ اس کی ایک کتاب ''مجموعۃ البحرین'' ہے، جس میں مسلمان صوفیوں اور ہندو جوگیوں کے حالات جمع کیے گئے ہیں۔ اس کی اہم ترین کتاب ''سرِ اکبر'' ہے، جس میں بنارس کے پنڈتوں کی مدد سے ''اپنشدوں'' کے تقریباً پچاس ابواب کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ روشن خیال عالم دین مولانا شبلی نعمانی نے ''سرِ اکبر'' کے نسخہ کو 1906ء میں ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس منعقدہ بنارس علمی نمائش میں دیکھا تھا۔ اس کتاب کے دیباچے کو پڑھنے کے بعد انہوں نے اپنے تاثرات ان الفاظ میں ظاہر کیے:
>
> ''عالم گیر نے داراشکوہ کے مقابلہ کا جب قصد کیا تو اس کا سبب یہ ظاہر کیا کہ داراشکوہ بدعقیدہ اور بددین ہے اس لیے اگر وہ ہندوستان کا فرماں روا ہوا تو ملک میں بددینی پھیل جائے گی۔ عام مؤرخوں کا خیال ہے کہ یہ محض ایک فریب تھا، نہ داراشکوہ بے دین تھا اور نہ عالمگیر کی مخالفت کا یہ سبب تھا۔ دلوں کا حال خدا کو معلوم، لیکن اس کتاب کے دیباچہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ داراشکوہ بالکل ہندو بن گیا تھا، اور کچھ شبہ نہیں کہ اگر وہ

تختِ شاہی پر متمکن ہوتا تو اسلامی شعار اور خصوصیات بالکل مٹ جاتے" (مقالاتِ شبلی، ج 7، ص 101، دارالمصنفین، اعظم گڑھ)

واضح رہے کہ شاہ جہاں کے آخری دور میں تختِ دہلی کے لیے اس کے بیٹوں داراشکوہ اور اورنگزیب عالمگیر میں شدید معرکہ آرائی ہوئی، جس میں عالمگیر فتح مند رہا۔

۵ رام موہن رائے (1774ء-1833ء) ہندو سماجی مصلح (سوشل ریفارمر) تھے، انہوں نے برہمو سماج فرقے کی بناڈالی۔ جس کا نقطۂ ماسکہ (Focal Point) خدا کی وحدانیت ہے۔ علامہ اقبال لکھتے ہیں:

> برہمو (سماجی) خدا پر یقین رکھتے ہیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا پیغمبر مانتے ہیں۔ لیکن انہیں ملتِ اسلامیہ میں شمار نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ قادیانیوں کی طرح وہ انبیاء کے ذریعے وحی کے تسلسل پر ایمان رکھتے ہیں، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ نبوت کو نہیں مانتے۔ (روزنامہ اسٹیٹس مین کو علامہ کا خط، مطبوعہ: 10 جون 1935ء، مشمولہ: "حرفِ اقبال" مرتبہ: لطیف احمد شروانی)

٦ جرمن فلسفی ہیگل (1770ء- 1831ء) کے تصورِ تاریخ کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا مضمون "ہیگل اور مارکس کا فلسفۂ تاریخ" جو اِن کی کتاب "تفہیمات" جلد دوم میں شامل ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے شعری مجموعے "ضربِ کلیم" کی ایک نظم بعنوان "ایک فلسفہ زادہ سید زادے کے نام" میں برگساں اور ہیگل کا ذکر اس طرح کیا ہے:

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا		زنّاریِ برگساں نہ ہوتا
ہیگل کا صدف گہر سے خالی!		ہے اس کا طلسم سب خیالی

محمد امجد حسین

استدراک

(از: مفتی محمد رضوان)

ملحوظ رہے کہ مذکورہ مضمون میں سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے علمائے دیوبند کی طرف گروہ بندی کی عصبیت میں حدِ کمال تک پہنچنے کی نسبت سے مجموعی طور پر تو ہمیں اتفاق نہیں، البتہ جزوی طور پر اتفاق سے انکار نہیں، کیونکہ علمائے دیوبند نے ضرورت کے وقت احقاقِ حق کا حق ادا کیا ہے، البتہ بعض اوقات کسی شخصیت کے افکار کی تردید کی ضرورت نہیں سمجھی، تو اس پر سکوت اختیار کیا۔ مولانا سندھی کا مسئلہ بھی اسی نوعیت کا تھا کہ شروع میں ان کے غیر معمولی متنازع افکار سامنے نہیں آئے تھے، اور جو افکار سامنے آئے تھے، ان پر اہلِ دیوبند کو پہلے ہی اختلاف تھا، اور اسی اختلاف کے پیشِ نظر مولانا سندھی کی دیوبند سے علیٰحدگی عمل میں آئی تھی۔ اور جب ترکِ وطن کے بعد مولانا سندھی کے غیر معمولی متنازع افکار سامنے آئے، تو ان کی مختلف شکلوں میں تردید کی جاتی رہی۔ اور جب مولانا سندھی کے متعدد افکار تحریری شکل میں منظرِ عام پر آئے، تو ان کی بھی تردید کی گئی، اگرچہ اس تردید کے انداز میں احتیاط کے پہلو کو ملحوظ رکھا گیا، جبکہ مولانا سندھی کی بعض املائی تحریرات مطبوعہ شکل میں کافی عرصہ بعد بلکہ بعض تو برصغیر کی تقسیم کے بعد منظرِ عام پر آئیں۔

ملحوظ رہے کہ مولانا سندھی 1915ء میں ہندوستان سے ترک وطن کر کے کابل پہنچے، اور کابل، روس، ترکی اور حجاز سے ہوتے ہوئے 1939ء میں واپس ہندوستان تشریف لائے۔ اس طرح بیرون ملک قیام کا یہ زمانہ 24 سال کے طویل عرصہ پر محیط ہے۔ اس زمانہ میں مولانا سندھی اکابر دیوبند سے دور اور غیر جنس صحبتوں میں قیام پذیر رہے۔ مولانا سندھی کی وفات 1944ء میں ہوئی۔ گویا وطن واپسی کے پانچ سال بعد آپ نے رحلت فرمائی۔ مولانا سندھی کی زندگی کا یہی وہ 29 سالہ دور ہے، جس کے افکار زیادہ متنازع ہیں۔

کسی بھی مکتبِ فکر کے بعض افراد کا عصبیت میں مبتلا ہونا کوئی بعید نہیں ہے۔اس طرح کے بعض افراد اہلِ دیوبند میں بھی ہو سکتے ہیں۔ بلکہ بعض حضرات کے مولانا سندھی کے بارے میں طرزِ عمل سے اس طرح کا اظہار بھی ہوتا ہے، اور اسی وجہ سے ان افراد کی بے جا حمایت کو ہم بھی عصبیت خیال کرتے ہیں۔

اسی وجہ سے مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کے نام اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا:

آپ نے سچ کہا کہ مولانا شبلی کی پیش گوئی کہ آخر دیوبند بھی کب تک دیوبند رہے گا، برہان والوں کے مضامین نے اسی کا ثبوت بہم پہنچایا۔

حضرت شاہ (ولی اللہ) صاحب کے ان ہی خیالات کی اس تشریح کو اگر سر سید اور شبلی کا قلم بیان کرے، تو بے دینی، اور اگر فضلائے دیوبند لکھیں، تو عین دین۔

ع بسوخت عقل از حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

(مکاتیب سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ، صفحہ ۱۸۷، مکتوب نمبر 108 مرتب: مسعود عالم ندوی مطبوعہ: مکتبہ چراغِ راہ، لاہور، اشاعتِ اول: مئی 1954ء)

یہاں بطور مزید وضاحت عرض ہے کہ ہماری نظر میں ماہنامہ ''برہان'' دہلی کی طرف سے مولانا سندھی کے متنازع افکار کی پر جوش حمایت عصبیت کی عکاسی کرتی ہے۔

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی صاحب نے اس سلسلہ میں تحریر فرمایا:

بے چارے مولوی مسعود عالم جنھوں نے (مولانا سندھی کے افکار کی تردید میں تفصیلی مضمون لکھا تھا) پر ندوی ہونے کا جرم عائد کر کے ان کو ختم کر دیا گیا۔ لیکن جب ان ہی دیوبندیوں میں سے ایک دیوبندی (یعنی مناظر احسن گیلانی) نے یہ دیکھ کر کہ جن کے بڑوں پر چھوٹی باتوں میں شیطان اخرس بننے کا خوف مستولی رہتا تھا، آج اتنی بڑی بات پر جب وہ چُپ ہیں، تو ان میں سے جو سب

سے چھوٹا ہے، وہی جماعت کے اس فرضِ کفایہ کو ادا کر کے گونگے شیطان کے الزام کا تو ازالہ کر دے، تو اب اس کو تنگ نظری اور دقیانوسیت سے متّہم کیا جا رہا ہے۔ اللہ اللہ! دیوبند اور دیوبند سے پڑھ کر نکلنے والے مولوی خدا کی شان ہے کہ اس خاکسار کو عہدِ حاضر کے افکار وخیالات، تحریکات ومؤثرات سے مطلع فرماتے ہیں (مولانا عبیدُ اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکرِ ولیُ اللّٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ، صفحہ ۱۶۱)

عصبیت کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے درجِ ذیل حدیث بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ أَمِنَ الْعَصَبِيَّةِ أَنْ يُحِبَّ الرَّجُلُ قَوْمَهُ؟ قَالَ: لَا، وَلٰكِنْ مِنَ الْعَصَبِيَّةِ أَنْ يَّنْصُرَ الرَّجُلُ قَوْمَهُ عَلَى الظُّلْمِ (مسند أحمد، رقم الحديث ١٦٩٨٩) [1]

ترجمہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول! کیا آدمی کا اپنی قوم (یعنی اپنی برادری یا خاندان وقبیلہ وغیرہ) سے محبت رکھنا بھی تعصُّب میں داخل ہے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں! بلکہ تعصب تو یہ ہے کہ آدمی اپنی قوم کے ظلم (یعنی ناحق چیز) پر مدد کرے (مسند احمد)

مذکورہ حدیث کی روشنی میں جو لوگ مولانا سندھی کی ناحق باتوں کی حمایت اور اس سے بڑھ کر ان کا دفاع کرتے ہیں، وہ اپنی روِش کے بارے میں خود فیصلہ کر سکتے ہیں۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ جمہور اہلِ حق علماء نے مولانا سندھی کی ناحق باتوں کو قبول نہیں کیا، اور نہ ہی ان کا بے جا دفاع کیا، بلکہ ان کی تردید کی، جس سے متعلق مضامین ہم نے اپنی کتاب میں نقل کر دیئے ہیں۔ البتہ جزوی طور پر جن بعض افراد نے ایسا کیا ہے، تو سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا دکھایا ہوا آئینہ ان کے سامنے ہے، اس میں وہ اپنے خدوخال ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

---

[1] قال شعيب الارنؤوط: حديث حسن (حاشية مسند احمد)

مولانا سندھی کی کتاب "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" پر تبصرہ

(از: سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب)

شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک: مولانا عبید اللہ سندھی۔ ضخامت: ۲۱۶ صفحات

کتب خانہ پنجاب، لاہور

اس کتاب میں مولانا عبید اللہ صاحب نے اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے اَتباع کی مساعیِ انقلاب و اصلاح کا ایک مجمل تاریخی نقشہ پیش کیا ہے، جس میں شاہ صاحب کے ظہور سے لے کر جمنا نربدا سندھ ساگر پارٹی کے قیام تک کی تاریخ بالکل ایک نئے رنگ میں ہمارے سامنے آئی ہے۔ مولانا کا اصل بیان مجمل ہے، جس سے ان کا مدعا پوری طرح واضح نہیں ہوتا، مگر حاشیہ پر ان کے تلمیذِ رشید مولانا نورالحق صاحب علوی کی تشریحات مفصل ہیں، جن سے مولانا کے بیان کو سمجھنے میں کافی مدد مل جاتی ہے۔ جہاں تک مولانا سندھی کی ذات کا تعلق ہے، کوئی شخص خواہ ان سے کتنا ہی اختلاف رکھتا ہو، بہر حال ان کے علم و فضل اور ان کی وسعتِ نظر اور ذکاوت و جَو دَت سے انکار کی جرأت نہیں کر سکتا، اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اس کتاب میں جو کچھ ان کے قلم سے نکلا ہے، اور جو کچھ ان سے استفادہ کر کے مولانا نورالحق صاحب نے لکھا ہے، وہ بہت سے لطیف علمی نکات اور بیش قیمت معلومات پر مشتمل ہیں، جن کی قدر نہ کرنا ظلم ہوگا، لیکن بحیثیتِ مجموعی جب ہم اس کتاب کو دیکھتے ہیں، تو اس میں تاریخ کم اور تاریخ سازی زیادہ نظر آتی ہے۔

تاریخ یا تاریخ سازی

اگر عالمِ برزخ میں شاہ ولی اللہ صاحب اور شاہ عبدالعزیز صاحب اور اس سلسلہ کے دوسرے بزرگوں کو جمع کر کے یہ کتاب ان کے سامنے پیش کی جائے، تو بعید نہیں کہ اپنے کارناموں کے اس مُرقّع کو دیکھ کر وہ حضرات خود بھی دنگ رہ جائیں۔

''حزبِ ولی اللّٰہی'' کا جو نظام اور پروگرام پیش کیا گیا ہے، اور معاصر تاریخ کے واقعات سے اس ''حزب'' کا تعلق جس طرح دکھایا گیا ہے، اس کی بیشتر تفصیلات کے لئے ''غالباً'' کے سوا کوئی اور بنیاد نہیں ہے۔ رہے اس ''حزب'' کے اساسی نظریات، تو اُن کی جو تعبیر مولانا نے اور ان کے فاضل شارح نے پیش کی ہے، اس کے بعض اجزاء کو معناً صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے، مگر بیشتر اجزاء تعبیر وتفسیر کی حد سے متجاوز ہیں۔

ماضی کے واقعات کو جدید طرز پر مرتب کرنا، یا بزرگانِ سلف کے کام کو جدید اصطلاحات میں بیان کرنا بجائے خود گناہ نہیں، لیکن اس ترتیب و بیان میں اپنے ایسے تصورات ونظریات کو داخل کر دینا جو اصلاً وہاں نہ تھے، ہمارے نزدیک کوئی صحیح طریقہ نہیں ہے۔ آخر اس میں کون سا امر مانع ہے کہ اپنے تصورات کو ہم خود اپنے ہی تصورات کی حیثیت سے پیش کریں؟ اگلوں کے کام میں ان کا سراغ لگانے کی کیا ضرورت؟

تحریکِ مجاہدین سے ناانصافی

''حزبِ ولی اللّٰہی'' کی تاریخ بیان کرتے ہوئے مولانا نے حضرت سید احمد بریلوی اور ان کے متبعین کی صادق پوری جماعت کو جس رنگ میں پیش کیا ہے، وہ اس رنگ سے بہت مختلف ہے، جس میں حضرت سید احمد صاحب کے معتقدین پیش کرتے ہیں۔

ان دو مختلف بیانات میں ایک ایک عنصر صداقت کا بھی معلوم ہوتا ہے، لیکن دونوں طرف مبالغہ کی رنگ آمیزی بھی اچھی خاصی نظر آتی ہے۔ ضرورت ہے کہ تاریخ کا ایک بے لاگ طالب علم اصل مآخذ کی چھان بین کر کے حقیقت کو، جیسی کہ وہ فی الواقع تھی، جوں کا توں بیان کر دے۔

تعصب اور تحزّب

اسی ''حزب'' کی پوری تاریخ میں مولانا نے اگر کسی کوتاہی کی نشاندہی کی ہے، تو وہ صرف حضرت سید احمد صاحب اور ان کے متبعین کے طرزِ عمل سے متعلق ہے۔ اس حصہ کو مستثنیٰ

کر کے وہ اس حزب کو بے عیب معیارِ حق کی حیثیت سے پیش فرماتے ہیں، اور یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسی حزب کے اتباع میں حق اور راستی دائر و منحصر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تحزّب کا اقتضاء یہی ہے کہ آدمی اپنی پارٹی کو اس طرح پیش کرے، لیکن ہم اس حزب کے ایک ایک بزرگ کی خاکِ پا کو سُرمۂ چشم بنانے کے باوجود نہ تو یہ بات تسلیم کر سکتے ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی غلطی وخامی سے پاک تھا، نہ یہ مان سکتے ہیں کہ جس قدر روشنی ہم کو ان کے علوم میں ملتی ہے، بس وہی ہمارے لیے کافی ہے، اور نہ اس کے لیے تیار ہیں کہ ہدایت ورہنمائی کے لیے صرف اسی حزب کو واحد سرچشمہ تسلیم کرلیں۔ ہمیں اگر فی الواقع دینِ اسلام کو از سرِنو ایک عالمگیر طاقت بنانا ہے، تو ہمارے لیے ناگزیر ہے کہ تیرہ سو برس کی طویل تاریخ میں دنیائے اسلام نے علم وعمل کے جس قدر بہترین نمونے پیش کیے ہیں، ان سب کے فوائد اپنے دامن میں سمیٹنے کی کوشش کریں، اور قرآن وسنت کی روشنی میں ماضی وحال دونوں کو خوب دیکھ کر اور سمجھ کر خود اپنی ایک مستقل فکر پیدا کردیں۔

(ماخوذ از: ترجمان القرآن، بابت اپریل 1942ء، جلد 2، عدد 2، بحوالہ ''ادبیاتِ مودودی'' صفحہ 222 تا صفحہ 224، مرتبہ: پروفیسر خورشید احمد، مطبوعہ: اسلامک پبلیکیشنز لمٹیڈ، لاہور، بارِ سوم: مارچ 1985ء)

''مولانا عبیداللہ سندھی: حالاتِ زندگی، تعلیمات اور سیاسی افکار'' مؤلفہ پروفیسر محمد سرور پر تبصرہ

(از: ماہر القادری صاحب)

مولانا عبیداللہ سندھی: از محمد سرور۔ ضخامت: ۴۶۴ صفحات۔ قیمت چھ روپے

ملنے کا پتہ: سندھ ساگر اکادمی، چوک مینار، انارکلی، لاہور۔

حضرت مولانا عبیداللہ سندھی (پیدائش 1872ء) کا شمار اکابر مشاہیر میں ہوتا ہے۔ وہ سکھ

گھرانے میں پیدا ہوئے، مگر حق کی جستجو اور صداقت کی لگن اُن کے اندر بالقوہ موجود تھی۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ آغازِ جوانی ہی میں کفر کے اندھیرے سے نکل کر ایمان و اسلام کی روشنی میں آ گئے۔ سندھ کے ایک خدا شناس بزرگ کے دست مبارک پر انہوں نے اسلام قبول کیا، اس کے بعد دینی علوم حاصل کیے۔ دیو بند میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ کی صحبت اور تلمذ سے فیض حاصل ہونے کا انہیں موقع ملا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاست اور عقیدت کا مرکز ترکی کی خلافت تھی۔ علی برادران ترکی کی حمایت ہی کی پاداش میں نظر بند کئے گئے، اُس دور میں ہندی مسلمانوں کا نعرہ یہ تھا:

''ہم ہی نہیں رہے جو خلافت نہیں رہی''

1915ء میں اپنے قابلِ فخر استاد حضرت شیخ الہند کے ایماء پر مولانا عبیداللہ سندھی کابل تشریف لے گئے۔ امیر حبیب اللہ خان اُن دنوں کابل کے فرمانروا تھے۔ مولانا سندھی، امیر موصوف کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی ترغیب دیتے رہے۔ کابل کے بعد حضرت مولانا سندھی روس اور ترکی میں رہے، پھر حجاز مقدس میں دس بارہ برس قیام کیا۔ 1939ء میں چوبیس برس وطن سے باہر رہنے کے بعد، ہندوستان کو مراجعت فرمائی۔ یہ جلاوطنی انہوں نے ہندوستان کی آزادی اور خلافت کے تحفظ کے لیے گوارا کی تھی۔

جناب محمد سرور (جامعی) نے مولانا عبیداللہ سندھی کے حالاتِ زندگی، تعلیمات اور سیاسی افکار پر یہ کتاب بڑی محنت سے لکھی ہے، جو 1943ء میں پہلی مرتبہ دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ اس وقت مولانا مرحوم بقیدِ حیات تھے۔ اس کے دو ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گئے۔ 1967ء میں اُس کا تیسرا ایڈیشن لاہور سے شائع ہوا۔ ''فاران'' میں تبصرے کے لیے جو کتابیں آتی رہتی ہیں، اس انبار میں یہ کتاب رَل مل گئی۔ اس کا افسوس ہے کہ اس کتاب پر بہت تاخیر سے تبصرہ آ رہا ہے۔

حضرت مولانا عبیداللہ سندھی انقلابی شخصیت کے حامل تھے، عالمِ دین، مفکر، صاحبِ ارشاد

وتصوف، سیاح اور سیاستدان اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے افکار کے مبلغ اور ترجمان! چراغ سے چراغ جلتا آیا ہے۔ دنیا کی یہی رِیت رہی ہے۔ مولانا سندھی کے افکار کیا تھے؟ اس پر ہماری تنقید آ گے آ رہی ہے، مگر اُن کی نیک نیتی اور اخلاص میں شک نہیں کیا جاسکتا۔ ملتِ اسلامیہ کے وہ خیر خواہ تھے، اور دنیا میں اسلام کا غلبہ چاہتے تھے۔ لیکن اخلاص ونیک نیتی اور اصابت رائے لازم وملزوم نہیں ہیں، خلوص اور نیک نیتی کے باوجود انسان سے فکر وعمل کی غلطی اور لغزشیں بھی ہوسکتی ہیں، اور ہوتی رہی ہیں۔ وہ اکابر واسلاف (رحمہم اللہ تعالیٰ) جن کی جوتیوں کی خاک میرے لیے سرمہ چشم بصیرت ہے، اُن کے ملفوظات، ارشادت اور کتابوں میں جو باتیں راقم الحروف (ماہر) کو کھٹکی ہیں، ان پر میں نے گرفت کی جرأت کی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس نقد واحتساب میں کہیں کہیں خود مجھ سے بھی بھول چوک ہوگئی ہو۔

> پروفیسر محمد سرور لکھتے ہیں: ”آپ [مولانا سندھی] نے کھلے دل سے روسی انقلاب کی ہر اچھی چیز کو سراہا، اور انقلاب برپا کرنے والوں کی معجزانہ قوتوں کو تسلیم کیا۔ لیکن اس کے باوجود آپ مسلمان ہی رہے، اور اسلام روسی انقلاب کی ان ساری بلندیوں سے بھی انہیں بلند تر نظر آیا“ (صفحہ ۳۴)

حیرت ہے کہ مولانا عبید اللہ سندھی نے ”روسی انقلاب کی ہر اچھی چیز کو سراہا“ اور یہ انقلاب جو خدا، مذہب اور اخلاق کے خلاف جارحانہ اقدام تھا، اس تصویر کا یہ تاریک رُخ اُن کی نگاہ سے اوجھل رہا۔ پھر ”زار“ کی شہنشاہیت کا تختہ اُلٹنے کے بعد ستر لاکھ کے قریب کسانوں کو اشتراکی حکومت نے محض اس جرم میں گولیوں سے اڑا دیا کہ وہ بے چارے کھلیانوں کے غلہ کو اپنی ملکیت سمجھتے تھے۔ کیا مولانا سندھی کو یہ خونریزی اور بے گناہوں کا قتلِ عام بھی نہیں کھلا، اور سرخوں کا ہر اقدام انہیں پسند آیا۔

> پروفیسر صاحب لکھتے ہیں: ”عرب اَن پڑھ تھے، انہوں نے سب قوموں کے

علموں کو سرآنکھوں پر لگایا (''پر'' کے بجائے ''سے'' لکھنا چاہیے) ان کا کوئی بندھا ٹکا نظامِ تمدن نہ تھا، انہوں نے سب تمدنوں کو کھنگالا، اور ''خذ ما صفا ودع ما کدر'' پر عمل کرتے ہوئے سب تمدنوں کے اچھے پہلو لے لیے۔ اسی طرح انہوں نے عیسائیت، یہودیت، مجوسیت اور صابئیت سب کو ایک آنکھ سے دیکھا، اور سب کو برملا طور پر کہہ دیا کہ انسان خواہ کوئی بھی ہو، جو انسانیت کے بنیادی اصولوں کو مان لے، وہ اچھا انسان ہے۔ نام، نسل، رنگ اور گروہوں کے امتیازات سب باطل ہیں۔ دوسرے معنوں میں عربوں نے انسانیت کو جو ٹکڑوں ٹکڑوں میں بٹ چکی تھی، اس کا شیرازہ پھر از سرنو باندھا اور الگ الگ اور باہم مخالف و متخاصم قومیتوں کو ایک صحیح بین الاقوامی نظام دیا، بقول مولانا عبیداللہ سندھی یہی اسلام کا عالم گیر انقلاب تھا'' (صفحہ ۹۱، ۹۲)

یہ بات تو سو فیصدی درست ہے کہ اسلام نے نسل و رنگ کے امتیاز کو مٹا دیا، اور دنیا کی بہت بڑی آبادی کو کلمہ جامعہ پر اکٹھا کر دیا، اس طرح انسانی وحدت کا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا۔ مگر سوال یہ ہے کہ عرب مسلمانوں کا کیا کوئی اپنا تمدن نہ تھا۔ عہدِ رسالت اور دورِ خلافت کا تمدن کیا بین الاقوامی تمدن تھا، یعنی اس تمدن میں کیا عجمی تمدنوں کے اچھے پہلوؤں سے استفادہ کیا گیا تھا۔ وہ جو پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا تھا کہ ہندو نہانے دھونے میں پیتل کی گڑوی استعمال کرتا ہے، اور مسلمان ٹونٹی دار لوٹا، بس یہی ان کے تمدنوں کا امتیاز ہے۔ مولانا سندھی بھی تمدن کے بارے میں غالبًا اسی قسم کی فکر رکھتے ہیں۔ حالانکہ تمدن کی بنیاد افکار پر ہے۔ مسلمانوں کے تمدن کی اساس اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور نبی آخر کی رسالت پر ہے۔ دوسرے تمدن مشرکانہ فکر کے رہینِ منت ہیں۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ''ترجمان القرآن'' میں جواہر لال نہرو کے اس تصورِ تمدن کی پرزور دلائل کے ساتھ تردید کی تھی۔ پھر جس قوم کے تمدن میں جو اچھائی پائی جاتی ہے، وہ مسلمانوں ہی کی متاعِ گم گشتہ ہے۔ ہاں!

جب مسلمانوں پر عجمیت کا غلبہ ہوا، تو ان کے تمدن کی سادگی تکلفات سے بدل گئی، جفاکشی کی جگہ ان میں آرام طلبی آ گئی ۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں مشرکانہ عقائد اور بدعات ہندوستانی تمدن کی ''باقیاتُ السیئات'' ہیں۔

> پروفیسر صاحب لکھتے ہیں: ''اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے مولانا [سندھی] نے ایک دفعہ کہا، مثلاً خدا اور بندے کے تعلق ہی کو لے لیجیے، کسی نے بندے اور خدا کے تعلق کو بیٹے اور باپ سے تعبیر کیا، کسی نے حلول سے، الغرض ہر قوم نے اپنے اپنے مزاج کے مطابق اس مافوق التعبیر تعلق کو عام فہم بنانے کی کوشش کی۔ مقصود سب کا ایک ہی تھا، لیکن تعبیریں جدا جدا ہو گئیں'' (ص۹۴، ۹۵)

انسانی وجود میں خدا کا حلول اور خدا کے تعلق کو ''اِبن اللہ'' سے تعبیر کرنا، ان مشرکانہ عقائد میں حیرت ہے، مولانا عبیداللہ سندھی کو کوئی خرابی نظر نہیں آئی۔ اس نقطۂ نگاہ سے تو مشرکینِ عرب جو بتوں کو پوجتے ہیں، وہ بھی خدا کو مانتے تھے، اور بتوں کی پرستش کو قربِ الٰہی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ کیا ان سب کا مقصود معاذ اللہ ایک (خدا پرستی اور خدا سے تعلق) ہی قرار دیا جائے گا؟

> مولانا سندھی نے فرمایا: ''صابئ عقائد میں مظاہر پرستی اساسِ دین ہے۔ ان کے نزدیک علوم لدنی کی تجلی کواکب پر ہوتی ہے، اور مظاہرِ قدرت کے آئینہ میں خالق کا جلوہ نظر آتا ہے، حنیفیت میں اس تجلی کی جلوہ گاہ افراد کاملین کا دل ہے۔ مولانا کے نزدیک قرآن حنیفیت اور صابئیت دونوں ملتوں کے افکار کا مرکزِ کمال ہے۔ صابئ ذہنیت بھی اس نور سے مستفید ہو سکتی ہے اور حنیفی بھی'' (ص۹۶)

صابئین کے عقائد اور ان کی تاریخ مستند کتابوں میں موجود ہے۔ ان کا ایک گروہ سبعہ سیاروں کی پرستش کرتا تھا، اور زحل، مشتری، مریخ، شمس، زہرہ، عطارد اور قمر کے ہیکل انہوں نے تعمیر کیے تھے۔ حضرت ابراہیم کے متبعین یعنی حنفاء کے مقابل فرقہ کا نام صابی ہے، مگر مولانا عبیداللہ سندھی کے عقیدہ کے مطابق قرآن حنیفیت اور صابئیت دونوں ملتوں کے افکار

کا مرکز ''کمال'' قرار پاتا ہے۔ ہم اس عقیدہ سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔

جن صابئین کو مولانا عبید اللہ سندھی نے حنفاء کا مشابہ قرار دیا ہے، ان کے بارے میں علامہ ابوبکر جصاص ''احکام القرآن'' میں لکھتے ہیں:

''......ان کے عقیدہ کے بنیاد سبعہ سیارہ کی تعظیم، ان کی پرستش اور ان کو معبود قرار دینا ہے...... جب قسطنطین نصرانی ہوگیا، تو اس نے بزور شمشیر ان کو نصرانیت قبول کرنے پر مجبور کیا۔ اس وقت سے بت پرستی تو موقوف ہوئی اور یہ بظاہر نصاریٰ کی جماعت میں آ ملے، مگر بہتیرے (صابئ) اس مذہب پر باقی رہے اور خفیہ بت پرستی کرتے رہے...... ایسوں کے متعلق فقہاء کے درمیان اس امر میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ نہ اہلِ کتاب ہیں اور نہ ان کا ذبیحہ کھایا جا سکتا ہے اور نہ ان کی عورتوں سے نکاح ہوسکتا ہے''

''صابئیت'' اور ''حنیفیت'' میں فرق نہ کرنا اور فلسفیانہ اور متصوفانہ نکتہ آفرینی سے ان کو مشابہ قرار دینا کتنی خوفناک لغزش ہے۔

''مولانا [عبید اللہ سندھی] نے فرمایا ''اگر شاہ ولی اللہ صاحب کے اس اصول کو سمجھ لیا جائے تو چینی قوم کے اعلیٰ اخلاقی تصور، یونانی فلسفہ، ایرانیوں کی حکمت آفرینی اور ہندو رشیوں کے بلند فکری نظام اور اسلام، یہودیت، اور عیسائیت میں بنیادی طور پر کوئی تضاد نہیں رہتا۔ اور کل انسانیت کے چوکھٹے میں ساری قوموں کے نظام، ادیان اور اخلاق اپنی اپنی جگہ ٹھیک بیٹھ جاتے ہیں'' (ص۹۸،۹۹)

یہ تو ''وحدتِ ادیان'' کا مسلک ہے، جس کا بانی ہندوستان میں رام موہن رائے تھا۔ مسلمانوں نے اس تصور کو قبول نہیں کیا اور نہ کرنا چاہیے۔

مولانا [سندھی] نے فرمایا کہ میں دین کو اسی بناء پر انسانیت کے لیے ضروری سمجھتا ہوں کہ اس پر چلنے سے ہر انسان کی انانیت (''انا'' لکھنا چاہیے تھا، اردو میں ''انانیت'' تو

خود بینی اور اپنے کو کچھ سمجھنے کو کہتے ہیں) بیدار ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے لوگوں نے خاص اپنے خاندان یا صرف اپنے ملک خاص اور محدود مذہب کو دینِ حق مان لیا۔

دین کا مقصد اور کام کیا صرف انسان کی ''انا'' کو بیدار کر دینا ہے۔ کافر دانشوروں اور غیر مسلم حکماء کی ''انا'' بھی بیدار ہوتی ہے۔ دین کے بارے میں ایسا فلسفیانہ تصور دینا کہ خدا، رسول، کتاب، ملائکہ اور آخرت پر ایمان کا عقیدہ بیک گراؤنڈ میں چلائے جائے، دین کے مفہوم ومقصد کی غلط تعبیر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ دین صرف ''اسلام'' ہے، اور مسلمان اپنے مسلم آباء کے دین کو مان کر کوئی غلطی نہیں کرتے۔ آباء پرستی اور فرقہ پرستی کی طنز تو ان لوگوں پر پھبتی ہے، جو مسلمان نہیں ہیں اور اپنے گمراہ آباء واجداد کے دین کو تھامے ہوئے ہیں اور قوم ووطن کی نسبت سے کافرانہ مذاہب سے چمٹے ہوتے ہیں۔

مولانا [سندھی] کے نزدیک فلسفہ ولی اللٰہی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے جذب وسلوک کی ایک ایسی راہ بتائی ہے، جو سب قوموں کے طرق وجذب وسلوک کا جامع ہے۔ اس میں اور اسلام میں تضاد بھی نہیں، نیز سارے ادیان ومذاہب کا بھی اس پر اتفاق ہوسکتا ہے (ص۱۳۴)

ہماری ناچیز رائے میں ولی اللٰہی فلسفہ وہ نہیں ہے، جس کی خصوصیت کا اظہار مولانا عبیداللہ سندھی نے مندرجہ بالا عبارت میں کیا ہے۔ تمام مذاہب کے طریقوں اور جذب وسلوک کا ملغوبہ چوں چوں کا مربہ نہیں تو اور کیا ہوگا۔ ہم اسلام کو دینِ خالص کی حیثیت سے مانتے ہیں۔ اس شجرۂ طیبہ میں دوسرے مذاہب کے عقائد وطرق کی پیوندکاری نہیں ہوسکتی۔

مولانا [سندھی] کا کہنا یہ ہے کہ یورپ کے موجودہ مادی اور معاشی نظام کو ہمیں لابدی طور پر قبول کر لینا چاہیے (ص۱۳۴)

یورپ کا معاشی نظام تو سود کو جائز قرار دیتا ہے اور اسلام میں سود حرام ہے بلکہ اسے اللہ اور رسول سے جنگ کرنے کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔ اس صورت میں مولانا سندھی کا یہ

مشورہ کہ یورپ کے موجودہ مادی اور معاشی نظام کو لابدی طور پر مسلمانوں کو قبول کر لینا چاہیے، دینی نقطہ نگاہ سے کس قدر غلط مشورہ ہے، توبہ۔ اب رہا یورپ کا مادی نظام اس میں شراب، خمار، خنزیر، عورتوں کا رقص اور نامحرم مرد و زن کا اختلاط، غرض فسق و فجور کی یہ تمام باتیں جائز ہیں، اور مولانا سندھی مغرب کے اس فاسقانہ مادی نظام کو قبول کرنے پر مصر ہیں، کوئی کہے تو کیا کہے۔

پروفیسر سرور لکھتے ہیں:...... ''اور ان کا اخلاص یہ تھا کہ محض محبتِ الٰہی سے خدا کی عبادت کریں نہ کہ امیدِ جنت اور خوفِ دوزخ سے'' (ص ۱۵۱، ۱۵۲)

دوزخ چونکہ محل غضبِ الٰہی ہے، اس لیے اس کے خوف سے برائیوں سے بچنا اور جنت محلِ رضائے الٰہی ہے، اس کی تمنا میں تقویٰ اختیار کرنا عین منشاءِ اسلام ہے۔ اس سے اخلاصِ عبادت میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ غزوہ احد کے سلسلہ میں صحیح بخاری اور مسلم کی روایت ہے:

''ایک بہادر مسلمان اس عالم میں بھی بے پروائی کے ساتھ کھڑا کھجوریں کھا رہا تھا، اس نے بڑھ کر پوچھا کہ یا رسول اللہ! اگر میں مارا گیا تو کہاں ہوں گا، آپ نے فرمایا ''جنت میں''۔ اس بشارت سے بے خود ہو کر وہ اس طرح کفار پر ٹوٹ پڑا، اور مر گیا''

جنت کی تمنا میں صحابیِ رسول کا کافروں سے لڑ کر شہید ہو جانا، اگر کسی کو کھٹکتا ہے، تو اسے اپنے مریض ذہن کا علاج کرانا چاہیے۔

مولانا [سندھی] نے ایک دفعہ فرمایا کہ بے شک ہم معاشی مُرفہ الحالی کے سلسلے میں تو اشتراکیت کے اصولوں سے بالکل متفق ہیں، اور ہم چاہتے ہیں کہ انسان کی کل معاشی ضروریات کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دی جائے، لیکن ساتھ ہی انسانیت کے اس رخ کو بھی جو اخلاق اور فکر کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے تشنہ نہ چھوڑا جائے

(ص ۱۸۶، ۱۸۷)

اشتراکیت عوام کو قیدیوں جیسی مرفہ الحالی دیتی ہے۔قیدیوں کو جیل خانہ میں رہنے کے لیے جگہ، پہننے کو کپڑا، کھانے کو غذا ملتی ہے، بیماری ہو تو مفت علاج ہوتا ہے۔مگر قیدیوں کے شہری حقوق غصب کر لیے جاتے ہیں۔قیدیوں جیسی مرفہ الحالی کو کوئی انسان پسند نہیں کرسکتا۔

......مولانا[سندھی] کے خیال میں بعد میں آنے والے حکمت اور فقہ کا لزوم بھول گئے، اوراسی وجہ سے اب مدرسہ دیوبند جمود اور رجعیت کا مرکز بن کر رہ گیا ہے۔

حالانکہ جہاں تک نظامِ تعلیم اور دیوبندی مکتبہ فکر کے اساسی اصول کا تعلق ہے، مدرسہ دیوبند میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ ہاں! دیوبند نے مولانا عبیداللہ سندھی کے مشورے کے مطابق کمیونزم اور یورپین ازم کو قبول نہیں کیا۔علمائے دیوبند کی نگاہ میں یہ دونوں ''ازم'' ضلالت کی علامتیں ہیں۔دیوبند کی یہ دینی روِش مولانا سندھی کو بھلی نہیں لگی، اس لیے جمود ورجعیت کی طنز فرمائی۔

مولانا[سندھی] فرماتے ہیں کہ اطعمہ کی تحلیل اور تحریم بیشتر قومی پسندیدگی اور مزاج کے مطابق ہوتی ہے۔اس کو عالمگیر مذہب کی تعلیم کا اساس بنانا ٹھیک نہیں ہوتا۔

(ص۲۹۰)

یہ بات گھوڑے، خرگوش، کچھوے، گوہ، ٹڈی وغیرہ کے بارے میں تو صحیح ہے، مگر مولانا نے کلیہ کے طور پر اطعمہ کی تحریم وتحلیل کو جس انداز میں پیش کیا ہے، وہ صحیح نہیں، مثلاً خنزیر مطلقاً اور بالاجماع حرام ہے، اور اس کی حرمت عالمگیر مذہب کی اساس سے خارج نہیں کی جاسکتی۔

[مولانا سندھی فرماتے ہیں]......''امام ابوحنیفہ فارسی زبان میں نماز پڑھنے کو جائز سمجھتے تھے، اور ان کی طرف جو رجوع کا قصہ گھڑا گیا ہے، میرے نزدیک وہ صحیح نہیں ہے''(ص۳۰۲)

رجوع کا قصہ درست ہے۔گھڑا نہیں گیا، اور اگر بالفرض محال اپنے اس فتویٰ سے امام ابوحنیفہ

نے رجوع نہیں کیا، تو اس مسئلہ میں ان کی رائے درست نہیں ہے۔ قرآن کریم ہی بتاتا ہے کہ قرآن کا کوئی جز نماز میں پڑھنا چاہیے (......ماتیسر من القرآن) اور قرآن کا ترجمہ قرآن کا متن نہیں ہوتا۔ قرآن کے ترجموں میں اختلافات پائے جاتے ہیں، اور اصل قرآن اختلاف سے محفوظ ہے۔ کسی کتاب کے ترجمہ کو متن کا درجہ نہیں دیا جاسکتا، اس لیے قرآن کا ترجمہ نماز میں پڑھنے سے ''ماتیسر من القرآن'' کے حکم کی تعمیل نہیں ہوتی۔

اگر کوئی شخص نمازِ مغرب سے تھوڑی دیر قبل اسلام قبول کرلے، تو اس سے کہا جائے گا کہ نماز میں ''اللہ'' کہتا رہے۔ ''اللہ'' بھی قرآن کریم کا ایک جزو ہے۔ پھر مغرب سے عشاء تک اسے سورہ فاتحہ یاد کرائی جائے گی۔ اس طرح ایک دو دن میں وہ نومسلم قرآن کی دو تین چھوٹی سورتیں حفظ کرسکتا ہے۔ اگر نماز میں ''اللہ'' کی جگہ ''خدا، God، پرمیشر، اہور اور تنگری'' کہے گا، تو نماز نہیں ہوگی۔ اور چودہ سو برس کی مدت میں آج تک کسی ملک کے نومسلم نے یہ شکایت نہیں کی کہ وہ عربی الفاظ ادا کرنے سے قاصر ہے۔ مولانا سندھی عربی زبان کو اتنی اہمیت نہیں دیتے، جتنی اہمیت عام مسلمان دیتے ہیں۔ عربی کے بارے میں مولانا سندھی کے نقطۂ نگاہ کے مطابق مصطفیٰ کمال نے اذان کے الفاظ کو ترکی لفظوں سے بدل دیا۔ یہ اسلامی تاریخ اور عبادت وشریعت کی ٹریجڈی تھی، استغفراللہ۔

مغل بادشاہ جلال الدین اکبر ایک جاہل شخص تھا۔ اس نے اللہ تعالیٰ کے دین کی تنقیص میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ یہ مسلمہ تاریخی واقعات ہیں، جن کی تردید نہیں کی جاسکتی۔ ہر دین پسند اور اسلام دوست مؤرخ نے اکبر کی دین سے اس بے پروائی بلکہ دشمنی پر نکیر کی ہے۔

مگر مولانا عبیداللہ سندھی اکبر کے مداح ہیں۔ وہ فرماتے ہیں: [1]

''چنانچہ اکبر پہلا مسلمان فرمانروا ہے، جس نے اس ملک میں آزاد اسلامی

---

[1] فاضل تذکرہ نگار نے ''اکبرِ اعظم'' کے باب سے پہلے لکھا ہے ''اس لیے نامناسب نہ ہوگا اگر ہم یہاں ہندوستان کے دو اولوالعزم اور عظیم المرتبت شہنشاہوں کے بارے میں مولانا سندھی کے جو خیالات ہیں، ان کا ذکر کردیں'' اس لیے جن عبارتوں کے اقتباسات ہم نے درج کیے ہیں، وہ مولانا ہی کے خیالات یا ان کے خیالات کی ترجمانی سمجھی جائے گی۔

ہندوستانی سلطنت کی بنیاد رکھی'' (ص ۳۳۴)

اکبر کی لادین سلطنت کو اسلامی سلطنت کہنا، واقعہ اور حقیقت کے ساتھ دردناک مذاق ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی جن کی دینی غیرت نے اکبر کی غیر اسلامی حرکتوں کی تائید نہیں کی، بلکہ نکیر اور اعلاءِ کلمۃ الحق کا فرض انجام دیا، ان کے بارے میں اس کتاب میں لکھا ہے:

''...... ملا صاحب بڑے سخت گیر مؤرخ ہیں...... ملا صاحب نے اکبر کے ان واقعات کو سطحی نظر سے دیکھا ہے، اور انہوں نے زیادہ تعمق سے کام نہیں لیا''

(ص ۳۳۵)

جی! بجا فرمایا ''تعمق وبصیرت'' تو فیضی اور ابوالفضل کو حاصل تھی، جو اکبر کے مؤید وہم خیال بلکہ اس کے بگاڑنے میں شریک تھے۔ عبدالقادر بدایونی بے چارہ ملا تھا، اس کے پاس نہ تعمق تھا، نہ بصیرت، ہاں! توحید وسنت اور دین وشریعت اور دینی غیرت کی دولت تھی۔ فیضی نے جب اکبر کی تعریف میں کہا:

''شکر صد شکر کہ خیر البشر پیدا شد''

تو ملا عبدالقادر بدایونی کی غیرتِ دینی پکار اٹھی:

''حیف صد حیف کہ شر البشر پیدا شد''

مولانا عبیداللہ سندھی، شہنشاہ اکبر اور مصطفیٰ کمال پاشا کی غیر اسلامی فکر اور اس کے عملی مظاہر کے مداح ہیں۔ اور یہ مولانا سندھی کی شخصیت کا انتہائی تاریک پہلو ہے۔ ع

''ننگہ کی نا مسلمانی سے فریاد''

پروفیسر محمد سرور لکھتے ہیں:...... ''اکبر کو اس کام میں شیخ مبارک اور ان کے دونوں بیٹوں فیضی اور ابوالفضل سے بڑی مدد ملی۔ چنانچہ اس سیاسی اتحاد کے لیے مشہور صوفی بزرگ شیخ اکبر محی الدین ابنِ عربی کے عقیدہ وحدتُ الوجود کو فکری اساس بنایا گیا'' (ص ۳۳۸)

''وحدتُ الوجودُ'' خالص تصوف کی اصطلاح ہے، اور فیضی وابوالفضل اوران کا آقاولی نعمت اکبر، ان میں سے کوئی بھی نہ صوفی تھا، اور نہ تزکیہ نفس اور ''احسان'' کے مراحل ومقاصد ان کے پیشِ نظر تھے۔ وحدتُ الوجود کا تعلق اکبر کی سیکولر حکومت سے جوڑنا بے سروپا بات ہے۔ وحدتُ الوجود کو دینِ الٰہی کی ضلالت آمیز ملغوبہ کی اساس اور مآخذ قرار دینا، ذہن وفکر کے دیوالیہ پن کی دلیل ہے۔

پروفیسر محمد سرور لکھتے ہیں: ''بے شک وحدتِ ادیان اپنی جگہ ٹھیک ہے، لیکن ہر دین کی شریعت کے قاعدوں اور قوانین کی پابندی کے بغیر جماعتی زندگی بھی تو قائم نہیں رہ سکتی'' (ص۳۴۵)

عجیب تضاد ہے کہ وحدتِ ادیان بھی اپنی جگہ ٹھیک ہے، اور شریعت کے قاعدوں کی پابندی بھی کرنی چاہیے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ گناہوں سے بچانے کے لیے آدمی کو نامرد بنادیا جائے، اور ساتھ ہی اس کی شادی بھی کردی جائے۔

[مولانا سندھی نے فرمایا] ''زندگی کی ابتداء معدنیات، نباتات اور حیوانات سے ہوئی۔ پھر انسان معرضِ وجود میں آیا۔ اس کے فکر کی ابتدائی صورت صابئیت تھی، اس منزل سے انسان آگے بڑھا، تو حنیفی دور میں داخل ہوا'' (ص۲۰۲)

انسان کی پیدائش کے بارے میں حیرت ہے، مولانا عبیداللہ سندھی قرآن کریم کے برخلاف ڈارون کی ارتقاء(Evolution) کی تھیوری کے قائل ہیں۔ یہ بھی غلط ہے کہ انسانی فکر کی ابتداء صابئیت سے ہوئی۔ پہلا انسان جو پیدا ہوا وہ مسلم تھا اور موحد تھا۔ یورپ کے مفکرین نے یہ غلط فہمی پھیلائی ہے کہ چاند ستاروں اور دوسرے مظاہر کی پرستش کے بعد انسان کے جذبۂ پرستش نے ترقی کی، اور وہ خدا کی پرستش کرنے لگا۔ حالانکہ پہلا انسان خدا کا پرستار تھا۔

اس بدگمانی کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ محمد سرور صاحب نے مولانا عبیداللہ سندھی کے عقائد وافکار

کی ترجمانی میں خیانت کی ہوگی۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کتاب پر مولانا سندھی کے معتقدین نکیر کرتے۔ کتاب کی زبان اور طرزِ انشا دل نشین ہے، مگر زبان و بیان کی غلطیاں بھی ملتی ہیں۔

''قربانیاں اور جفا کشیاں'' (ص ۳۳) جفاکشی کی جمع جفا کشیاں غریب و نامانوس ہے۔ ''اقوام میں کسی تحریک کو محفوظ کرنے کا یہ اساس ہے'' (ص) اساس مؤنث ہے۔ ''جیسے انہیں دیوانے کتے نے کاٹ کھایا'' (ص ۱۸۹) دیوانے غلط نہیں ہے، مگر ''باؤلے کتے'' روزمرہ ہے۔ ''ان کو بدنی سزائیں دیں'' (ص ۲۱۶) ''جسمانی سزائیں'' فصیح تر ہے۔ ''انقلاب کرنے کے لیے ہمیشہ ایک جماعت کی ضرورت ہوتی ہے'' (ص ۲۱۷) ''انقلاب کرنا'' غلط زبان ہے ''انقلاب لانے کے لیے'' لکھنا چاہیے تھا۔ ''انبیاء کو اگرچہ عوام وخواص دونوں کی ہدایت مقصود ہوتا ہے'' (ص ۲۸۰) ''کو'' ممکن ہے کتابت کی غلطی ہو ''کا'' کا محل تھا۔ ''اصل ان دھڑا بندیوں کا نتیجہ تھا'' (ص ۳۵۱) ''دھڑے بندیوں'' لکھنا تھا۔ ''ہندوؤں سے کلی انقطاع کے منصوبے کرنے لگے'' (ص ۴۱۴) ''منصوبے کرنے لگے'' غلط ہے ''منصوبے بنانے لگے'' یا ''منصوبے باندھنے لگے'' کا محل تھا، ممکن ہے کتاب میں ''تیار'' چھوٹ گیا ہو (منصوبے تیار کرنے لگے)

مولانا عبیداللہ سندھی مفکر انقلابی عالم تھے، ان کا مطالعہ بھی وسیع تھا، شاہ ولی اللہ کے فلسفہ کے وہ مبلغ اور ترجمان ہیں، اور ملتِ اسلامیہ کے بہی خواہ ور دردمند۔ مگر روس اور یورپ کی مادی ترقیوں نے ان کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دی تھی۔ اس لیے انہوں نے مسلمانوں کو یورپین ازم اور کمیونزم قبول کرنے کا مشورہ دیا کہ اس طرح مسلمانوں کی مالی حالت سدھر جائے گی، اور کمیونزم کے ذریعہ معاشی ناہمواری کا سدِ باب ہوجائے گا۔ اخلاق، تقویٰ اور آخرت کی اہمیت معاشیات اور اقتصادیات اور مساوات کے ہجوم میں دب کر رہ گئی۔ ہندوستان پہنچتے ہی انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو اس بات کی تلقین کی کہ وہ کوٹ پتلون پہننا شروع کر دیں۔ یہ یورپ کے تمدن وتہذیب کی چمک دمک سے متاثر ہونے کا

نتیجہ تھا۔ اسی زمانے میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اعلان فرمایا تھا کہ دیوبند مولانا عبیداللہ سندھی کے افکار کا ذمہ دار نہیں ہے۔ شہنشاہ اکبر اور مصطفیٰ کمال جیسے مخالفِ دین مشاہیر مولانا عبیداللہ سندھی کے ممدوح ہیں، مگر اس کے برخلاف دیندار فرمانروا محی الدین اورنگ زیب عالمگیر کی روش ان کو پسند نہیں ہے۔

ہم مولانا سندھی کے عقائد وافکار سے جن کی جھلکیاں اوپر دکھائی گئی ہیں، کسی عنوان متفق نہیں ہیں۔ عقل کی بھول بھلیوں سے اللہ تعالیٰ ہر صاحبِ ایمان کو محفوظ رکھے۔ (آمین)

(ماہنامہ ''فاران'' کراچی، صفحہ 37 تا 44، اکتوبر 1974ء)

''مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے افکار وخیالات پر ایک نظر''

مرتبہ مولانا مسعود عالم ندوی پر تبصرہ

(از: مولانا سید ریاست علی ندوی صاحب)

مولانا سید ریاست علی ندوی صاحب (المتوفیٰ: 1976ء) دار العلوم ندوۃ العلماء کے فاضل ہیں، اور حضرت مولانا سید سلیمان ندوی صاحب رحمہ اللہ کے تلامذہ میں سے ہیں۔ موصوف 1924ء سے 1937ء تک مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کے ساتھ ''دار المصنفین، اعظم گڑھ، انڈیا'' کے ساتھ وابستہ رہے۔ اس دوران تصنیف وتالیف کے علاوہ ماہنامہ ''معارف'' میں بھی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ آپ کی تصانیف میں ''تاریخِ اندلس، عہدِ اسلامی کا ہندوستان، اسلامی نظامِ تعلیم'' اور اس کے علاوہ چند دیگر کتب شامل ہیں۔

مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کے افکار وخیالات پر چند مستقل کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ زیرِ نظر رسالہ ان کے جواب ونقد میں ترتیب پایا ہے۔ مولانا مرحوم اپنی زندگی میں پرشور انقلابی حوادث سے دوچار ہوتے رہے، اور ان کی زندگی کے ہر نئے موڑ پر نیا ماحول اور نئے افکار ان کے سامنے آتے گئے۔ دیوبند کی دینی ومذہبی فضا سے نکل کر لادینیت کے مرکز ماسکو میں پہنچنا، پھر ترکی میں عین اسی زمانہ میں آنا، جب کہ تجدد پسند ترک پوری ترکی قوم کی قلبِ

ماہیت میں مصروف تھے، پھر اچانک حجاز میں چلا جانا، جہاں نجد کی دینی تحریک کو نیا غلبہ حاصل ہوا تھا، ان کے افکار میں تزلزل پیدا کرنے کے لیے کچھ کم موثرات نہ تھے۔ ان سب ملکوں میں دینی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی افکار و خیالات میں شکست و ریخت کا عمل غیر معمولی سرگرمی سے جاری تھا۔ مولانا مرحوم نے ان متضاد ماحولوں میں اپنی غیر معمولی فطری ذہانت پر اعتمار رکھ کر ان متضاد افکار و خیالات کو تولنے اور انہیں ردوقبول کرنے کا عمل جاری رکھا، اور اپنی فطری ذہانت سے متضاد افکار نظریوں اور رایوں کو ہم آہنگ کرنے اور اپنے فہم کے مطابق ان میں باہم رابطہ قائم کرنے میں اپنی ذہانت کا حیرت انگیز کمال دکھایا۔

اتفاق کی بات ان کے خیالات کی ترجمانی کے لیے جو ذی علم نوجوان پروفیسر محمد سرور (جامعی) نامزد کیے گئے، انہیں بھی چھوٹے پیمانہ پر تقریباً اسی قسم کے متضاد ماحول سے سابقہ رہ چکا تھا۔ ایک طرف وہ جامعہ ملیہ سے وابستہ تھے، دوسری طرف وہ اسی چہار دیواری میں مولانا سورتی مرحوم کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، جنہیں بقول موصوف اسلاف کے تتبع میں بڑا تشدد تھا، اور طالب علم کے لیے شریعت کی معمولی سے معمولی شعار کی بھی عدمِ پابندی کو گوارا نہ کر سکتے تھے۔ پھر وہ مصر پہنچے، اور ایک طرف وہ جامعہ ازہر کے شیوخ کے حلقہ درس میں بیٹھے، اور دوسری طرف مشہور مصری بے دین ملحد، ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے لکچروں میں شریک رہے۔ اور جب وہ مصر سے لوٹے تو بقول خود ایک مسلسل ذہنی کوفت ہر لمحہ اضطراب کی کیفیت، نہ کامل یقین، اور نہ پورا انکار، تشکک، جو ہر وقت دماغ کو مصروف اور دل کو پریشان رکھے ...... یہ حاصل تھا، جو وادی نیل سے لے کر راقم الحروف وطن لوٹا'' (مقدمہ مولانا عبیداللہ سندھی، ص ۱۴) دراصل یہ موزوں ترین ذہنی آئینہ ہو سکتا تھا، جس میں مولانا سندھی کے متضاد افکار و خیالات کی عکاسی کا کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام پا سکتا تھا، اور یہ حقیقت ہے کہ ترجمان نے بڑی دلکشی و خوش سلیقگی سے اپنا فرض انجام دیا، متضاد افکار و خیالات کو ایک سلسلہ میں پرونے، انہیں تشبیہات و تمثیلات سے سنوارنے، کسی ایک ہی واقعہ کو دو متضاد

زاویوں سے دیکھنے،اوردونوں کو بظاہر دلنشین انداز میں سمجھا دینے کی ایسی کم مثالیں ملیں گی۔ لیکن حق و باطل کوخواہ جتنے پردوں میں چھپایا جائے،جس قسم کا آب و رنگ دیا جائے،اور ذہانت کی مدد سے جیسے نتائج مرتب کیے جائیں،اہلِ نظر پران کی حقیقتیں آشکار رہیں گی۔مگر اسلام اور مسلمانوں کی مذہبی،تمدنی اور ملی زندگی کے لیے ایسی کتابیں زیادہ نقصان رساں نہیں، جو کھلے طور پر الگ شاہراہ اختیار کر کے تیار کی گئی ہوں،لیکن ایسی کتابوں سے جیسی کہ مولانا سندھی کے سلسلہ میں شائع ہوئی ہیں،خصوصاً نوجوان اور دین اور اسلامی تاریخ وتمدن سے نادان مسلمان طبقوں میں جس قسم کے زہریلے اثرات کے پھیلنے کا امکان ہوسکتا ہے، اس کا حقیقی اندازہ لگانا بھی دشوار ہے۔

مولانا سندھی نے جب ابتداءً اپنے خیالات ظاہر کیے،تو ان کے دیرینہ عقیدت مند حلقوں میں ان کے مفہوم ومعانی پرشک وشبہ کی نظر ڈالی گئی۔الفرقان کے ولی اللہ نمبر میں مدیر الفرقان نے ان کی عبارتوں کے مختلف مفہوموں کے اعتبار سے ایسے پہلوؤں کو اختیار کرنا چاہا، جو مسلمہ حقائق کے مخالف نہ ہوں،اور دبی زبان سے انکے مخالف پہلوؤں کے مطالب سے اختلاف کر کے ان کی تردید کی۔لیکن مولانا سندھی اپنے افکار کی اشاعت کے لیے ایک مستقل مجلس کی تاسیس عمل میں لا چکے تھے،چنانچہ وہ مستقل تصنیفات کی شکل میں بڑی آب و تاب سے شائع کیے گئے،اور ملک کے سنجیدہ حلقوں میں ان کی مستقل تردید کی ضرورت محسوس کی گئی۔چنانچہ اس سلسلہ میں سب سے پہلے مولانا مسعود عالم صاحب ندوی نے معارف میں ان کی دو کتابوں پر اپنا سلسلہ مقالات شائع کرایا۔اب ان مضامین کا مجموعہ عام افادہ کے لیے عنوانِ بالا سے رسالہ کی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔موصوف کا پہلا سلسلۂ مضامین مولانا سندھی کی زندگی میں شائع ہوا تھا،چنانچہ مولانائے مرحوم اور ناقد کے درمیان بعض خیالات کی تشریح وتوضیح میں مراسلت بھی ہوئی،یہ خطوط بھی رسالہ میں منسلک کر دیے گئے ہیں،جن سے رسالہ کی افادیت میں اضافہ ہوگیا ہے۔نیز رسالہ کی ابتداء میں حضرۃ الاستاذ مولانا سید

سلیمان ندوی مدظلہٗ کا ایک مختصر و جامع مقدمہ ثبت ہے، جس میں ہندوستان میں مسلمانوں کے دورِ تنزل اور اس کے دور کرنے کے لیے مختلف مصلحین و مفکرین کی مساعی کا ذکر آیا ہے، اور ان کے نتائج اختصار سے پیش کیے گئے ہیں۔ پھر مولانا سندھی کے سوانحِ حیات کے پسِ منظر سے انکا جائزہ لیا گیا ہے، اور ان کی بعض غلطیاں نمایاں طور پر دکھائی گئی ہیں۔ افسوس ہے کہ اس سلسلہ میں صفحہ ۱۵ پر مولانائے مرحوم کے افکار کے تذکرہ میں ان کے مآخذ کا حوالہ شائع ہونے سے رہ گیا ہے، انشاء اللہ معارف کے کسی آئندہ نمبر میں یہ مقدمہ مع حوالوں کے نقل کرلیا جائے گا۔

مولانا مسعود عالم کا پہلا سلسلہ مضمون مولانا سندھی کی تصنیف ''شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک'' پر استدراک و تنقیح کے عنوان سے ہے۔ مولانا سندھی نے اس تصنیف میں حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادہ کو ایک منظّم سیاسی تحریک چلانے والے کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ ناقد نے اس پر فاضلانہ نقد کیا ہے، اور اس سلسلہ میں مولانائے مرحوم نے مرکزیت ثابت کرنے کے لیے واقعات کو جس رنگ میں پیش کیا ہے، اس کی اصل حقیقت ظاہر کی ہے۔ مولانا نے ''پارٹی'' کی اس تشکیل میں حضرت مولانا سید احمد شہید اور حضرت مولانا اسماعیل شہید رحمہ اللہ کے ان مجاہدانہ خدمات کو جو ان کے ہاتھوں انجام پائے، اور جس کا غلغلہ ایک زمانہ میں پورے ہندوستان میں بلند ہوا، گویا ایک ضمنی حیثیت دے دی ہے، پھر اس تحریک کے بڑے بڑے اکابر جو مختلف صوبوں میں گزرے، ان کا تذکرہ بھی ایسے اسلوب میں کیا ہے، جو حقیقت سے دور تھا۔ ناقد نے تاریخی حقائق و شواہد سے ان بزرگوں کا اصل مقام دکھایا ہے۔ نیز چونکہ اس تحریک کے اکابر اپنے عقائد کے لحاظ سے مولانا سندھی کے بقول، اسلام کی ''حجازی'' تعبیر کے بجائے ''عجمی'' یا ''ایرانی بائی لاز'' کے پیرو نہ تھے، اس لیے مختلف موقعوں پر ان کے ساتھ انصاف قائم نہ رہ سکا۔ ناقد نے اپنے بحث و نظر میں ان مسائل کو بھی صاف کیا ہے، نیز بعض دوسری تحتانی بحثیں بھی آئی ہیں۔

دوسرا مقالہ ''مولانا عبید اللہ سندھی'' نامی تصنیف پر لکھا گیا ہے، اس کتاب میں مولانا کے مختلف نوعیّتوں کے افکار پیش کیے گئے ہیں، جن کا تعلق عقائد، کلام، تصوف، فقہ، تاریخ و سیاست سب ہی سے ہے، اس کے ساتھ مولانا کے چند خاص مذہب آمیز سیاسی افکار و خیالات ہیں۔اس سلسلہ میں مولانا نے ایک طرف پوری اسلامی تاریخ اور دوسری طرف ہندوستان کے پورے اسلامی عہدِ حکومت کا اپنے نقطۂ نظر سے جائزہ لیا ہے، اور عجیب وغریب تضاد کے ساتھ اپنے نظریے بیان کیے ہیں۔ناقد نے اسلامی علوم و عقائد کے مباحث پر جامعیت سے نقد کیا ہے، اور اسلام کے صحیح نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے، اور تاریخی مباحث میں واضح اغلاط کو نمایاں کیا ہے۔

مولانا کے افکار کا جائزہ لینے کے لیے مستقل تصانیف کی ضرورت ہے۔وہ ایک ہی سانس میں متضاد باتیں کہہ جانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ایک ہی بات کو جداگانہ زاویۂ نگاہ سے پیش کرتے ہیں، اور ایک دوسرے سے متضاد نتائج نکالتے ہیں، مثلاً ایک طرف تو وہ اسلام کو انٹرنیشنل مذہب کی صورت میں پیش کرتے ہیں، دوسری طرف ''فی کل ارض آدم مثل آدمکم و نوح مثل نوحکم'' ایک حدیث کا حوالہ دے کر کہتے ہیں:

> ''یہاں ارض سے مراد قوم ہے، اور دنیا کو سات بڑی بڑی قوموں، تہذیبوں یا عالمین میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔توریت، انجیل اور قرآن صرف اس طرح کی ایک قوم کی تاریخ ہے، اسی قسم کے واقعات تقریباً سب قوموں میں گزرے ہیں''
>
> (مولانا عبید اللہ سندھی، ص ۸۶)

اس طرح قرآن مجید صرف ایک قوم یعنی عرب کی تاریخ بن گیا۔

پھر فرماتے ہیں:

> ''مخاطبین کی رعایت سے اسے ایک خاص زبان اور مکان سے مخصوص کرنا ہوتا ہے، قرآن کے پیرایہ بیان کی محدودیت بھی اسی بناء پر ہے'' (ایضاً، ۸۶)

اس کے بعد عالمگیریت اور جامعیت کے تصور کو لاتے ہیں، مگر محض ''بین السطور مفہوم'' کے اعتبار سے، چنانچہ فرماتے ہیں:

''لیکن اس کے باوجود جا بجا بین السطور مفہوم کی عالمگیریت اور جامعیت نمایاں ہے۔ اگر آدمی قرآن کے مطالعہ میں تدبر و تعمق سے کام لے، تو اس پر واضح ہوجائے گا کہ کل نوعِ انسانی قرآن میں اپنا مافی الضمیر مقصد پاسکتی ہے'' (ایضاً،ص ۸۶،۸۷)

گویا اس کا کافۃ للناس ہونا یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رحمۃ للعالمین ہونا وغیرہ سب کے سب قرآن مجید کے بین السطور مفاہیم ہیں، اور اس کے اصل مخاطب محض عرب ہیں، بایں ہمہ وہ انٹرنیشنل مذہب ہے۔

اسی طرح مولانا کے نزدیک حقیقی مومن و کافر کی وہ نشانیاں نہیں، جو قرآن مجید نے اپنی واضح آیات میں پیش کی ہیں، بلکہ:

''انانیت کا بیدار نہ ہونا مولانا کے نزدیک کفر ہے، اور جس کی انانیت بیدار ہوجائے، گو رسمی طور پر، اسے لوگ کافر کہتے ہوں، وہ حقیقت میں مسلمان ہوتا ہے'' (ایضاً،ص ۱۰۱)

گویا خواہ کوئی توحید، ذات وصفات کا قائل ہو یا نہ ہو، رسالتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا خواہ کوئی اقرار کرے یا انکار، یا بدرجہ اعلیٰ سکوت اختیار کرے، لیکن اس کی انانیت بیدار ہوچکی ہے، تو وہ مسلمان ہے، اور عند اللہ بری الذمہ۔ ظاہر ہے کہ ان عقائد کو اسلام سے کیا تعلق ہوسکتا ہے؟

مولانا کے نزدیک ''اسلامی تصوف'' پر سب سے زیادہ اثر ہندو ویدانتی فکر کا ہوا ہے (ایضا،ص ۱۳۱) حالانکہ اسلامی تصوف کا تمام تر دارومدار کتاب وسنت پر ہے۔ تصوف وہی ہے جس کو شریعت کی اصطلاح میں احسان سے تعبیر کیا گیا ہے، اور جس کو مولانا جذبۂ تصوف سے

موسوم کرتے ہیں (ایضاً، ص۱۳۰) البتہ یکسوئی کے حاصل کرنے کے لیے ذریعہ و آلہ کے طور پر بعض طریق عمل باہر سے اختیار کیے گئے ہیں، لیکن ان کی حیثیت ویسی ہی ہے، جیسے کہ بعض بزرگوں کی تمثیل کے مطابق نماز کے اوقات کے انضباط کے لیے گھڑی سے مدد لی جاتی ہے۔ اس طریقِ عمل کو عقائد و روحانیت سے تو کوئی علاقہ نہیں ہے۔

مولانائے مرحوم کا خیال ہے کہ ایران و ہندوستان کے مسلمانوں میں ''آریائی ذہنیت'' ہمیشہ باقی رہی۔ عقیدہ کی تبدیلی سے فرد یا جماعت کی ذہنیت نہیں بدلا کرتی۔ ایرانی و ہندوستانی مسلمان ہوئے، تو انہوں نے پیروں اور پیغمبروں کو وہ درجہ دے دیا، جو قبل از اسلام اپنے بزرگوں کو دیتے تھے، اور پیر کا حکم خدا کا حکم سمجھا جاتا تھا (ایضاً، ص۱۵۶)

اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے متعلق ارشاد ہے کہ ''انہوں نے تجلی کا مسئلہ حل کر کے ایک طرف تو ایرین فلسفی (حکمت) اور سامی نبوت میں اس اختلاف کو رفع کر دیا، اور دوسری طرف غیر مسلموں پر اسلام کی حقانیت ثابت کرنا آسان ہو گیا'' (ایضاً ۱۵۶)

ان مسائل میں جن کا تعلق خالصۃً کتاب و سنت اور نفسِ اسلام سے ہے، ان میں آریائی ذہنیت کا سراغ لگانا، اور ان بزرگوں پر وطنیت کے جذبہ و اثر سے آریائی ذہنیت کو قبول کرنے کا الزام لگانا کیسی صریح ناانصافی ہے۔ اگر اس موقع پر اسلام میں اتباعِ رسالت کی جو تشریح کی گئی ہے، اور تصوف میں شیخ کا جن اوصاف سے متصف ہونا، اور اس کے اتباع میں جن جن قیود و حدود کے قائم رکھنے کی تلقین کی گئی ہے، مولانا انہیں اپنی نگاہ میں رکھتے، تو وہ اس قسم کے نظریے قائم نہ کر سکتے تھے۔

مولانا فرماتے ہیں:

> ''نبوت انسان کی جبلی استعداد کا انکار نہیں کرتی، اور انسان کی جبلی استعداد اس کے خاص ماحول سے ہی بنتی ہے، مثلاً ہندوستان میں فطرۃً ذِبح حیوانات پسندیدہ نہیں، اس لیے اگر کوئی ہندوستانی ذبِح حیوانات سے بچے، تو اس کا یہ فعل خلافِ

نبوت نہ ہوگا، کیونکہ انسانوں کی جو فطرت ہوتی ہے، نبوت اس کے خلاف نہیں جاتی۔نبوت کا کام یہ ہے کہ وہ افراد کے فطری رجحانات اور ان کی جبلی استعدادوں کے مطابق ان کے لیے ترقی کی راہیں بتائے (ایضاً،ص ۲۵۵)

یہاں اولاً یہ سوال ہوسکتا ہے کہ یہ کلیۂ صحیح کیونکر ہے کہ ہندوستان میں قدرۃً ذبح حیوانات پسندیدہ نہیں۔اگرایسا ہوتا،تو قربانی کے جو احکام ویدوں میں آئے ہیں، وہ کیوں پائے جاتے، یا آج بھی ہندوؤں (جینی، بودھ نہیں) میں عام طور پر قربانی کی رسمیں کیوں انجام پاتی ہیں۔ان میں رسومِ قربانی کے ترک کرنے کی تلقین تو صرف پارس ناتھ،مہابیر اور بودھ نے کی ہے،لیکن نرگرنتھ جین اور بودھ مت کے ماننے والوں کی کتنی تعداد ہندوستان میں پائی جاتی ہے۔بودھ مت کے فروغ کے بعد جب برہمنوں کے دورِحکومت میں اس کے خلاف تلقین کی گئی،تو ہندوستان کی فطرت و جبلت کے مخالف ہونے کے باوجود قربانی کی رسموں کو دوبارہ کیوں فروغ حاصل ہوا۔

اگر چہ یہ صحیح ہے کہ ویدک دھرم کے کچھ پیروؤں نے جین اور بدھ مت کے ایک اصول ''اہنسا'' کو اپنے دھرم میں وسعت دے کر قبول کرلیا،لیکن ان کی فطرت و جبلت سے اس کا کیا تعلق ہوسکتا ہے۔یہ تو قربانی کے سلسلہ میں آریوں میں جو بے شمار خرافات رسمیں پھیل گئی تھیں،اور جن سے ان کا دھرم رسموں کا ایک گورکھ دھندا بن گیا تھا،اس کے خلاف اہنسا کے اصول کا پرچار ایک موثر اصلاحی قدم تھا۔اگر آریوں کی فطرت و جبلت ذبح حیوانات کو ناپسند کرتی،تو ان میں قربانی اور اس سلسلہ میں بے شمار رسموں کو مقبولیت سرے سے حاصل ہی نہ ہوتی،اور نہ ان مصلحین کو ان کی اصلاح کی ضرورت پیش آتی۔علاوہ ازیں کسی خاص مصلحت سے کسی خاص جانور کے ذبح سے دست کش ہوجانا بھی نفس ذبح حیوانات سے جبلۃً انکار کرنے کے مترادف نہیں ہے۔

علاوہ ازیں اگر ہندوستان میں ذبحِ حیوانات کی ممانعت ''خلافِ نبوت'' نہیں تھی،تو

مولانا کے بقول فقہ حنفی کی تشکیل و تدوین تو آریائی ضرورتوں اور ذہنیتوں کے لحاظ سے آریائی نسل کے مسلمان اکابر کے ہاتھوں ہی انجام پائی تھی۔اور ان کے بقول فقہ حنفی دراصل ''ایرانی بائی لاز'' ہے، جو آگے چل کر فارسی بولنے والی قوموں کے مرکز دہلی میں اسلام کی ایک مستقل فقہ کی حیثیت سے نموپذیر ہوئی۔(شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ، ص ۱۷۹) اور قرآن کے بین الاقوامی قانون کی حجازی تعبیر عربوں کے لیے قومی مذہب تھی، اور اس کی حنفی تعبیر عجم کا قومی دین قرار پائی (ص ۲۶۲) اور اسی سبب سے امام ابوحنیفہ معانی ہی کو قرآن سمجھے (ص ۲۶۷) بایں ہمہ ان ایرین نژاد مسلمان فقہاء نے اسلام کے اس ایرانی بائی لاز یا عجم کے اس اسلامی ''قومی دین'' میں بھی جو مرکز دہلی میں مدون ہوا، اور احکامِ نبوت کے خلاف بھی نہ تھا، پھر بھی ''ذبحِ حیوانات'' کو اس فقہ میں بھی ممنوع یا ناپسندیدہ نہیں کیا گیا۔جب اس ایرانی بائی لاز نے ایرین قوموں میں سے ایک بڑی قوم کی جبلت وفطرت تک کا کوئی لحاظ نہیں کیا، تو آخر کس قسم کی وطنی، نسلی رعایتیں اس ''بائی لاز'' میں ملحوظ رکھی گئی ہیں کہ اس کو ''ایرانی بائی لاز'' سے موسوم کیا جائے۔مولانا اپنے خیالات کے تولنے کے لیے جو ترازو تیار کرتے ہیں، ان کے نظریے اس ترازو پر بھی تو پورے نہیں اترتے۔مولانا کے افکار و خیالات اسی قسم کے خلاف واقعہ و خلافِ قیاس تعبیرات کا ایک خوشنما انبار ہے۔

اکبر کے متعلق مولانا کا دلچسپ نظریہ ہے۔وہ اس کے دینِ الٰہی کے بڑے مداح اور اس کو فکر کی عظیم ترین بلندی تصور فرماتے ہیں۔دینِ الٰہی کے مبادی وعقائد اور اسلام کی تعلیمات میں جو بیّن تضاد ہے، وہ اہلِ علم سے پوشیدہ نہیں۔ناقد نے اس کی طرف اشارے کیے ہیں، نیز اس سلسلہ میں حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب کے متعلق جو غلط فہمی پھیلائی گئی تھی کہ ان کے نزدیک اس کا اقدام عین صواب تھا (ص ۳۲۵) اس کے متعلق حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے مقدمہ میں شاہ صاحب کی کتاب ''انفاس العارفین'' کے اقتباس کو پیش کر کے، اس کا پردہ چاک کیا ہے۔

اکبر کے سلسلہ میں مولانا سندھی کے افکار عجیب قسم کے تضاد کے حامل ہیں۔
ایک طرف وہ فرماتے ہیں:
''اکبر پہلا مسلمان فرمانروا تھا، جس نے اس ملک میں آزاد اسلامی ہندوستانی سلطنت کی بنیاد رکھی، جو نہ ایران کی حلقہ بگوش تھی اور نہ عثمانی سلاطین کے تابع۔ یہ مسلمانوں کی قیادت میں ہندوستان میں قومی حکومت کی تشکیل تھی، اور اسلام کے اصول وقوانین کے اندر ہندوستانی قومیت اور اس کے تمدن اور تہذیب کو زندہ کرنے کی کوشش'' (ص۲۹۳)
پھر اسی سانس میں فرماتے ہیں:
''حکومت کا دین اسلام نہ رہا، اکبر اب صرف مسلمانوں کا بادشاہ نہ تھا، بلکہ سارے ہندوستانیوں کا فرمانروا تھا، اور ساری رعایا بادشاہ کی نظر میں یکساں اور مساوی تھی (ص۲۹۷)

اب صرف سوال یہ رہ جاتا ہے کہ جس حکومت کا دین اسلام نہ رہا ہو، اور جس کی نظر میں مسلم اور غیر مسلم میں کوئی ذاتی امتیاز نہ ہو، اس کو آزاد اسلامی ہندوستانی سلطنت (ص۲۹۳، ص۳۰۹، ص۳۱۴) سے کیونکر موسوم کیا گیا، وہ آزاد ہندوستانی سلطنت تو کہی جاسکتی ہے، مگر اس پر اسلامی کا انطباق کس حیثیت سے کیا جاسکتا ہے۔
اسی سلسلہ میں دوسری دلچسپ بات یہ ہے کہ مولانا کے بقول ''اکبر کے دینِ الٰہی کی بنیاد عقیدہ وحدۃ الوجود کی اصل حقیقت پر ہے'' (ص۲۹۷) پھر خود ہی ارشاد فرماتے ہیں کہ ''ابنِ عربی جو مسلمانوں میں اس فکر کے بانی اور مبلغ ہیں، ان کی اپنی زندگی اتباعِ حدیث کا نمونہ تھی، چنانچہ وہ (ابن عربی) خود فرماتے ہیں کہ ہر حقیقت جو خلافِ شریعت ہو گمراہی ہے'' (ص۲۹۷)
یہاں یہ سوال ہوسکتا ہے کہ اکبر کا دینِ الٰہی خلافِ شریعت تھا یا نہیں، اگر خلافِ

شریعت تھا، تو اس فکر کے بانی و مبلغ ابنِ عربی کے فیصلہ کے مطابق وہ گمراہی قرار پاتا ہے، یعنی انہی کے فلسفہ پر اس کی بنیاد ہے، اور ان ہی کی نظر میں وہ گمراہی ہے۔

اورنگ زیب کے متعلق مولانا کا خیال ہے کہ اس کی خواہش تھی کہ:

''وہ اس ہندوستانی اسلامی سلطنت کے دائرہ اثر کو اتنی وسعت دے کہ اس کے اندر خیبر پار کے ملک بھی آ جائیں، اور حجاز پر بھی اس کا اقتدار ہو، اور یہ اس وقت تک ممکن نہ تھا، جب تک وہ اپنی حکومت کو اسلامی رنگ نہ دیتا، اور اکبری سیاست کے بارے میں اسلامی دنیا میں جو غلط فہمیاں پیدا ہوگئی تھی، ان کو رفع نہ کرتا'' (ص ۳۱۴)

اس طرح غریب اورنگ زیب عالمگیر نے اسلامی آئین و احکام کی جو کچھ پابندی کی، اور اپنے حدودِ حکومت میں شریعت کے نفاذ کے لیے جو قدم اٹھایا، وہ للّٰہیت و اخلاص کے بجائے تمام تر سیاسی حکمتِ عملی پر مبنی قرار پاتا ہے، اور اکبر کی روش کی جو اس نے مذمت کی، وہ اس لیے نہیں کہ اس کے دینی نقطۂ نظر سے ایسا کرنا ضروری تھا، بلکہ وہ ''غلط فہمیوں'' کو دور کر کے عالمِ اسلامی پر قبضہ کرنے کے لیے اپنی فضا کو سازگار بنانا چاہتا تھا، اور اس کے سیاسی تدبر، دور اندیشی، اور فکر عالی کے پردہ میں اس کے سر پر یہ سارے بہتان اس لیے تھوپے گئے کہ اس کے ہاتھوں ''ہندوستان سیاسی و ذہنی ارتقاء کی اس منزل پر پہونچ سکے کہ وہ ایشیائی ممالک میں بین الاقوامی سیاست کا ایک اہم مرکز بن سکے'' (۳۱۶) لیکن عالمگیر کے ہاتھوں ہندوستان کو بین الاقوامی سیاست کا مرکز دکھانے کی کوششوں میں خود غریب عالمگیر کے دین و اخلاق کا دامن کس قدر داغدار ہوگیا، اس پر نگاہ نہ جاسکی، اور نہ اس نظریہ کو پایۂ ثبوت تک پہنچانے میں یہ نظر آسکا کہ ایسی حالت میں حکمران و کشور کشا کی حیثیت سے خود عالمگیر کا مرتبہ کس قدر گر جاتا ہے کہ وہ اپنے ۵۰ سالہ دورِ حکومت کے باوجود اس مقصد کے حصول میں اس قدر ناکام رہا کہ مغرب میں اپنے حدودِ حکومت سے باہر کی سرزمین کا ایک چپہ بھی اپنے قبضہ

میں نہ لا سکا، بلکہ اپنے خیال کو عمل کا جامہ پہنانے کے لیے ایشیائی حکومتوں میں سے کسی ایک حکومت کے حدود میں بھی قدم رکھنے کا حوصلہ نہ کرسکا۔ اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ صرف ہندوستان کے لیے ایشیائی سلطنتوں میں بین الاقوامی مرکزیت کا طغرائے امتیاز حاصل کرنے کے لیے عالمگیر کی ثنا خواہی کے پردہ میں اس کے دین مذہب، سیرت و کردار کو کس قدر مسخ کیا گیا ہے، اور اس مرقع میں اس کی جیسی تصویر اتاری گئی ہے، کیا اس کے عہد کی تاریخ کے پڑھنے والے ایک لمحہ کے لیے بھی اس کو صحیح باور کرسکتے ہیں۔

لائق ناقد نے اس رسالہ میں مولانا کے اسی قسم کے افکار و خیالات کا جائزہ پوری کامیابی کے ساتھ لیا ہے، اور مختلف دینی کلامی و تاریخی مسائل و مباحث میں ان کے بے بنیاد نظریوں اور قیاسوں اور غیر صحیح دلیلوں کی نشان دہی کی ہے۔ امید ہے کہ جن طبقوں میں مولانا کے افکار پڑھے گئے ہیں، ان میں اس رسالہ کو خاص طور پر مطالعہ میں لایا جائے گا کہ اہلِ نظر حقائق کے صحیح سراغ کا ایک اجمالی خاکہ دیکھ لیں، اور غلطیوں کی ان ہی نشاندہیوں پر مولانا کے بے شمار نت نئے افکار اور نظریوں کا اجمالی تصور کرسکیں، اور اسلامی حلقے ان مضرتوں کے پھیلنے سے محفوظ رہیں، جو ان افکار کی ترویج سے پیدا ہوسکتی ہیں۔

(ماہنامہ ''معارف'' جنوری 1945، نمبر 1، جلد 55)

صاحب مکتوب کی خواہش پر دستیاب شدہ مندرجہ بالا تحریرات پیش کردی گئی ہیں، جن سے معلوم ہوا کہ مولانا سندھی کی فکر پر متعدد اہلِ علم و اہلِ قلم حضرات نے ماقبل زمانہ میں بھی گرفت کی ہے، اور یہ کوئی جدید روِش نہیں ہے، اللہ تعالیٰ اعتدال کو ملحوظ رکھنے کی توفیق بخشے۔ آمین۔

فقط

وَاللّٰہُ سُبۡحَانَہٗ وَتَعَالٰی اَعۡلَمُ وَعِلۡمُہٗ اَتَمُّ وَاَحۡکَمُ.

محمد رضوان 14 / ربیع الآخر / 1438ھ 13 / جنوری / 2017ء بروز جمعہ

ادارہ غفران، راولپنڈی